مثنویاتِ میرؔ
کا
تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر صدیق محی الدین

مثنویاتِ میر کا تنقیدی مطالعہ

مثنویات میر کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر صدیق محی الدین

ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

مثنویات میر کا تنقیدی مطالعہ

مصنف : ڈاکٹر صدیق محی الدین
مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔
ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی
10 میٹرو پول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔

Masnaviyat-e-Meer ka Tanqeedi Mutaliya

By

Dr. Siddiq Mohiuddin
Cell: 09096157937
E-mail: siddiqmahiuddinshaikh@yahoo.com

ISBN: 978-93-80934-44-0

Edition : 2011
Price: **Rs.280/-**
Library Editon: Rs. 425/-

Printed & Published by

M. R. PUBLICATIONS

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books
#10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910
E-mail: abdus26@hotmail.com

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے (مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے

حسنین سیالوی

0305-6406067

انتساب

اپنے فرزند

شیخ اکرام حفیظ

کے نام

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقام رنگ و بو کا راز پا جا

برنگِ بحر ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

(اقبال)

مشمولات

صفحہ نمبر

پیش لفظ		7
باب اوّل :	میر تقی میر مختصر سوانحی حالات	9
باب دوم :	مثنویات میر کا تنقیدی مطالعہ	19
	۱) ستائش ہائے گونا گوں	
	۲) ہجویات	
	۳) مثنویات شکارنامہ	
	۴) مثنویات جذبات عشق	
باب سوم :	مثنویات میر کا عمومی جائزہ	119
کتابیات		124
مثنویات میر		125

پیش لفظ

میر تقی میر کو اہل اُردو خدائے سخن کہتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو ہر استاذ سخن نے میر کی عظمت کو تسلیم کیا ہے اور پھر خود میر کو بھی اس کا احساس تھا۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر اس کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرادیوان رہے گا

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

غرض میر اُردو غزل کے لاثانی فن کار تھے۔ انہوں نے غزل کو لامحدود پیرائہ اظہار اور اسالیب عطا کئے۔ آج بھی ان کے یہ ادب پارے اسی اہمیت و افادیت کے حامل ہیں جیسے میر کے عہد میں تھے۔ لیکن ایک غزل گو سے قطع نظر ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے بھی میر اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے شمالی ہند میں اُردو مثنوی کو اعتبار اور استحکام عطا کیا۔ موضوعاتی جدت اور تنوع کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان کے بھی مختلف النوع اسالیب اختیار کئے۔ میر شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے بنیاد گزاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنوی نگاری سے پہلے مثنوی کی روایت قائم کی۔ اس لحاظ سے میر کی مثنوی نگاری کا مطالعہ یقیناً صنف مثنوی کے تحقیقی و تنقیدی امکانات کو اجاگر کرتا ہے۔ میں نے بساط بھر کوشش کی کہ میر کی تمام مثنویات کا تنقیدی مطالعہ وضاحت کے ساتھ کر سکوں۔ اگر چہ میر کی مثنویات پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔

بہر حال میر کی مثنویوں کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ ان مثنویوں پر مزید لکھا جا سکتا ہے۔ آخر میں مثنویات میر کا متن بھی شامل کتاب ہے۔ یہ متن عبدالباری آسی کے مرتبہ کلیات میر سے نقل کیا گیا ہے۔

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز کے مالک میرے دوست جناب عبدالصمد صاحب نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری بڑی خوشی سے قبول کی، میں اس کے لئے اُن کا ممنون ہوں۔

ڈاکٹر صدیق محی الدین
اسوسی ایٹ پروفیسر
ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر
مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

میر تقی میر۔ مختصر سوانحی حالات

میر کی سوانح سے متعلق یہاں پر کوئی نئی تحقیق تو نہیں کی گئی ہے۔ میر پر تحقیق کرنے والے مختلف اہل قلم نے اپنی تحقیقی کاوشات یادگار چھوڑی ہیں۔ بس انہیں کی روشنی میں کچھ اہم نکات پیش کیے جارہے ہیں۔ اگر چہ مختلف تذکروں میں میر کی سوانحی کوائف موجود ہیں لیکن خود میر نے اپنی خودنوشت ''ذکرمیر'' میں بھی بہت سی معلومات پیش کی ہیں۔ میر کے بارے میں مزید جاننے کے لئے یہ کتاب ایک اہم ذریعہ ہے۔ اگرچہ میر نے اسے فارسی نثر میں لکھا ہے، لیکن اس کتاب کا اُردو نثر میں ترجمہ بھی موجود ہے۔ اُردو ترجمہ نثار احمد فاروقی نے کیا ہے۔

میر نے خود اپنی خودنوشت کے آغاز میں لکھا ہے کہ ان کے بزرگ ملک حجاز کو ترک کر کے مصیبتیں اٹھاتے ہوئے دکن سے ہوئے احمد آباد (گجرات) میں آکر بس گئے۔ اور پھر بعد از آں اکبر آباد (آگرہ) آکر سکونت اختیار کرلیتے ہیں۔ میر کے مطابق ان کے جداعلیٰ نے اکبر آباد قیام کے کچھ عرصے بعد آب وہوا راس نہ آنے کے سبب انتقال کیا۔ انہوں نے اپنی یادگار ایک لڑکا چھوڑا تھا جو میر کے دادا تھے۔ پھر میر کے دادا بھی روزگار کی تلاش میں تگ ودو کرتے رہے آخر کار انہیں اکبر آباد میں فوجداری کا کوئی عہدہ حاصل ہوا اور وہ ایک عام زندگی گزارنے لگے۔ یہ بھی بہت لمبی عمر تک نہیں جئے۔ پچاس سال کے لگ بھگ ان کا بھی انتقال ہوا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کسی ذہنی خلل کے شکار تھے جو جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ چھوٹے میر تقی میر کے والد تھے۔ تذکروں میں میر کے والد کا نام عبداللہ درج ہے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بھی ان کا یہی نام لکھا ہے۔ میر تقی میر ''ذکرمیر'' میں اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں۔ [1]

''وہ صالح اور نیک سیرت جوان تھے۔ دل میں (عشق کی) گرمی رکھتے تھے۔ اور علی متقی کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن انہوں نے اپنے پیرو مرشد سے عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں

رہ کر اپنے عقائد جیسا کچھ درست کر لئے ہیں وہ آپ پر واضح ہیں۔"

میر مزید لکھتے ہیں۔

"علی متقی روز و شب خدا کی یاد میں محو رہتے تھے۔ کبھی استغراق کی کیفیت کم ہوئی تو فرماتے:

"بیٹا عشق کرو، عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے اگر عشق نہ ہوتا تو نظام عالم قائم ہی نہ ہو سکتا۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے، عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔ عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔ آگ میں سوزش عشق سے ہے اور پانی میں روانی عشق سے ہے، خاک میں عشق کا قرار ہے اور ہوا میں اس کا اضطرار ہے۔ موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہوشیاری ہے۔ دن عشق کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔ مسلمان عشق کا جمال اور کافر اس کا جلال ہے۔ لیکن عشق کا قرب اور گناہ اس سے دوری ہے۔ جنت عشق کا شوق اور دوزخ اس کا ذوق ہے عشق کا مقام و مرتبہ، بندگی سے زہد و عرفان سے، سچائی اور خلوص سے اشتیاق اور وجدان سے بھی بہت بلند و بالا ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آسمانوں کی یہ گردش بھی عشق ہی کے باعث ہے۔"[۲]

غرض میر کے والد ایک صوفی صافی اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ مال و دولت کچھ نہیں رکھتے تھے۔ میر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ گھر کی ماما سے کچھ کھانے کیلئے مانگا۔ لیکن اس وقت گھر میں کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ یہ اسی حالت میں اٹھے اور لاہور کا رخ کیا وہ راوی کے کنارے اس فریبی درویش سے ملے جو لوگوں کو طرح طرح سے دھوکے دیا کرتا تھا۔ اس ریاکار سے بحث کے بعد کچھ بددل ہوئے اور پھر کسی دوسرے فقیر کے ہاں شب گزار کر دس بارہ دن کی مسافت کے بعد دہلی پہنچے۔ یہاں پر شیخ عبدالعزیز عزت کے بیٹے قمرالدین خاں کے مکان پر قیام کیا جن سے کچھ قرابت تھی۔ شہر کے لوگوں کو پتہ چلا تو کئی لوگ ان سے ملنے اور شرف نیاز کرنے حاضر ہوئے۔ امیر الامرا صمصام الدولہ نے بھی آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بہر حال وہ منع کرتے رہے اور یہ رات تہجد کی نماز پڑھ کر آگرہ کے لئے چل پڑے اور دو تین دن کے بعد بیانہ پہنچے۔ یہاں پر ان کی نگاہ ایک نوجوان سید زادے پر پڑی وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ لوگوں نے اس کی حالت دیکھ کر کچھ دعا کرنے کی درخواست کی۔ لہذا آپ نے پانی پر کچھ دعا دم کر کے چھڑکا اور کچھ اسے پلایا۔

اسے کچھ ہوش آیا تو وہ باادب بیٹھ گیا۔ لوگوں نے آپ سے گزارش کی کچھ توقف فرمائیں اور خدمت کا موقع دیں لیکن آپ نے منع کیا۔ اتفاق سے اسی وقت اس نوجوان کی شادی تھی۔ لوگوں نے شرکت کرنے کی درخواست کی، انہوں نے کہا کہ فقیر کو ان جھگڑوں سے کیا سروکار، اور پھر یہ اکبرآباد چلے آئے۔ اس نوجوان کو ان کے جانے کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوا اور اپنی نئی دلہن کو چھوڑ کر ان کی تلاش میں نکل پڑا، آخرکار لوگوں سے دریافت کرتا ہوا اکبرآباد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے اس کی حالت پر رحم کیا اور اپنے پاس ٹھہرایا۔ اور پھر یہ لڑکا بھی ان کی فیض تربیت سے درویشی کے مقام تک پہنچا۔ بعدازاں انہوں نے اسے اپنے تمام معاملات کا ذمہ دار بنایا۔ دراصل اسی شخصیت کا نام سید امان اللہ تھا، اور علی متقی کے انتقال کے بعد جنہوں نے میر کی تعلیم و تربیت کی۔ میر انہیں عم بزرگوار کہتے تھے۔

علی متقی کی پہلی بیوی خان آرزو کی ہم شیرہ تھیں۔ میر کے بڑے بھائی حافظ سید حسن (سوتیلے بھائی) اسی بیوی سے تھے۔ ان کا عقد ثانی میر کی والدہ کے ساتھ ہوا۔ جن سے کلیم، میر تقی میر، اور محمد رضی کی ولادت ہوئی تھی۔ میر کے والد کی وفات سے متعلق صفدر آہ لکھتے ہیں۔[۳]

''میر کے والد نے چونسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ جب میر گیارہ سال کے تھے میر نے چھ سات سال کی عمر میں ہوش سنبھالا ہوگا تو ان کے والد ساٹھ سال کے ہوں گے۔ ذاتی اووصاف درویشی کے علاوہ بھی ان کی عمر نے ان کی شخصیت کو اور پراثر بنا دیا ہوگا۔'' [۴]

میر سید امان اللہ کے زیرتربیت کوئی تین سال رہے اور جب ان کا بھی انتقال ہوا تو وہ مزید تنہا اور بے آسرا ہوئے۔ والد مرحوم کے اثاثے میں کوئی تین سو کتابیں تھیں جن پر میر کے بڑے بھائی حافظ سید حسن نے قبضہ کر لیا تھا۔

میر کے سن پیدائش سے متعلق اگرچہ اختلافات رہے ہیں۔ پھر بھی نثار احمد فاروقی نے میر کے دواوین اور دیگر کتب کے تجزیے کے بعد ان کی پیدائش سے متعلق درج ذیل خیال کا اظہار کیا ہے۔

''وہ ایک مسلمہ روایت کے مطابق ۱۱۳۵ھ/۲۳-۲۲ ۱۷ء میں پیدا ہوئے

اور انہوں نے ۱۱۵۲ھ، ۱۷۳۹ء کے بعد کسی وقت دہلی میں سکونت اختیار
کی اور یہاں سید سعادت امروہوی کی ترغیب و تحریک سے ''زبان اُردو
معلّیٰ شاہ جہاں آباد'' میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ گویا خود میر نے اپنے قول
کے مطابق ۱۶۔۱۷ سال کی عمر میں ریختہ کہا۔'' ۵

میؔر اپنے عم بزرگوار سید امان اللہ کی فیض تربیت میں کوئی تین سال رہے۔ ان کے ساتھ قرآن شریف کے علاوہ دیگر رسمی درسیات کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ سید امان اللہ کی وفات کے بعد میؔر اپنے والد بزرگوار کی فیض تربیت سے مستفید ہوئے۔ لیکن سید امان اللہ کی وفات کے بعد میر بے حد غمگین رہنے لگے تھے۔ انہیں ان کے والد صبر و رضا کی تلقین کرتے تھے اور پھر کچھ عرصے بعد میر کے والد علی متقی بھی انتقال کر جاتے ہیں۔ میر نے ذکر میر میں لکھا ہے کہ ان کے والد کی موت دھوپ لگنے اور شدید بخار کی وجہ سے ہوئی۔ معالج نے علاج کیا لیکن اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اپنے بڑے لڑکے حافظ محمد حسن کو بلایا اور نصیحت کی کہ میں تو درویش آدمی ہوں، میرے پاس کوئی اثاثہ نہیں صرف گھر میں یہ تین سو کتابیں ہیں۔ انہیں دونوں بھائی تقسیم کر لینا۔ یہ سن کر حافظ حسن نے کہا کہ میں چونکہ طالب علم ہوں اور ان کتابوں کی ضرورت مجھے ہے محمد تقی چھوٹے ہیں یہ کتابیں ان کے لئے بے کار ہیں۔ بیٹے کا یہ جواب سن کر علی متقی غمگین ہوئے۔ میر نے یہ واقعہ ذکر میر میں بیان کیا ہے۔ میر کہتے ہیں۔

''اس وقت حافظ محمد حسین کو بلایا جو میرے بڑے اور علائی بھائی تھے۔ اور
فرمایا کہ ''میں فقیر ہوں'' میرے پاس کچھ اثاثہ نہیں، بس تین سو کتابیں
ہیں۔ وہ میرے سامنے لاؤ اور بھائیوں میں تقسیم کر لو۔ وہ کہنے لگے۔
''میں طالب علم ہوں اور میرا کتابوں سے بیشتر واسطہ رہتا ہے، یہ چھوٹے
بھائی کتابوں سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ ان کے ورق پھاڑ ڈالیں گے۔
ایک پتنگ بنائے گا۔ دوسرا ناؤ بنا کر پانی میں بہا دے گا اگر آپ یہ سب
کتابیں مجھی کو سونپ دیں تو اچھا ہے۔ ورنہ آپ مختار ہیں۔'' ۶

غرض بیٹے کا یہ جواب سن کر علی متقی غمگین ہوتے ہیں اور وہ میر تقی میر کو حوصلہ اور ہمت دیتے ہیں۔ انتقال سے قبل یہ بھی کہا کہ میں بازار میں تین سو روپے کا مقروض ہوں جب تک قرض ادا نہ ہو میرا جنازہ نہ اٹھائیں۔ اور انہیں دعا دے کر جان جان آفریں کے سپرد کی۔ کہیں سے پانچ سو روپے کی ہنڈی آ رہی تھی۔ وہ آئی جس سے میر نے تین سو روپے کا قرض ادا کیا اور پھر والد کی تجہیز و تدفین کی۔

والد کے انتقال کے بعد میر بالکل بے آسرا اور بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔ وہ کن حالات میں دلی پہنچے اور وہاں پر کس کے پاس ٹھہرے یہ واضح نہیں ہوتا۔ البتہ ''ذکر میر'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر ان کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوئی جو امیر الامرا صمصام الدولہ کے بھتیجے تھے۔ انہوں نے میر کو نواب کے حضور پیش کر کے ان کا تعارف کروایا۔ نواب نے ان کے حال پر رحم کھا کر ان کے لئے ایک روپیہ روزینہ مقرر کیا۔ اس موقع پر میر نے ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس وقت ایک درخواست نواب کے حضور پیش کی کہ اس پر دستخط فرما دیں تاکہ متصدیوں کو کوئی حیلہ بہانہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ نواب نے عرض کیا ''یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے'' یہ سن کر میر کو ہنسی آئی کہ قلمدان کسی جاندار کا نام تو نہیں کہ اس کے حاضر ہونے یا نہ ہونے کا کوئی وقت مقرر ہو۔ جب کسی ملازم سے کہہ دیں۔ قلمدان حاضر کیا جا سکتا ہے۔ نواب کو بات معقول معلوم ہوئی اور انہوں نے دستخط کر دیے۔ یہ روزینہ انہیں صمصام الدولہ کی وفات ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء تک ملتا رہا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے محمد شاہ پر حملہ کیا۔ اس نادری حملے میں دلی میں قتل عام ہوا۔ جس میں ۳۰ ہزار سے زائد لوگ مارے گئے۔ اس حملے میں نواب صمصام الدولہ بھی مارے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد میر کا مقرر کردہ روزینہ بند ہو گیا۔ نادری حملے کی اس شورش سے پریشان ہو کر وہ آگرہ لوٹتے ہیں، لیکن وہاں پر کوئی بھی ان کا ہمدرد اور غم گسار نہیں تھا۔ سوتیلے بڑے بھائی حافظ محمد حسن پہلے ہی ان کے مخالف تھے۔ اغلب ہے کہ اسی دور میں میر تقی میر کا آگرہ میں وہ معاشقہ ہوا ہو۔ جس کی طرف انہوں نے مثنوی خواب و خیال میں بھی اشارے کئے ہیں۔ غالباً اسی معاشقے کی وجہ سے آگرہ میں دیگر لوگ اور ان کے سوتیلے بھائی حافظ سید حسن ان سے بدظن ہو گئے ہوں۔ اسی معاشقے کی وجہ سے میر پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

نادری حملے کا ہنگامہ ختم ہوا تو میر دوبارہ دلی چلے گئے۔ اب وہ اپنے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن کے ماموں خان آرزو کے گھر قیام کرتے ہیں۔ خان آرزو اس وقت دہلی میں ایک عالم و فاضل اور باکمال انسان تھے۔ فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ غرض علم و فضل میں وہ ایک مستند درجہ رکھتے تھے۔ میر تقی میر ان کے فیض صحبت سے یقیناً مستفید ہوئے ہوں گے۔ لیکن ''ذکر میر'' میں میر نے لکھا کہ ان کے بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے اپنے ماموں کو خط لکھا کہ ''میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے۔ اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہئے بلکہ دوستی کے پردہ میں کام تمام کر دینا چاہئے۔ میر کے مطابق خان آرزو نے اپنے بھانجے کے خط کو بہت سنجیدگی سے لیا اور میر کے ساتھ انہوں نے تکلیف دہ رویہ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے میر کافی پریشان ہوئے۔ آخر کار انہوں نے خان آرزو کے یہاں کی سکونت ترک کر دی۔ واضح رہے کہ یہ زمانہ میر کے لئے سخت آزمائش اور مصیبت کا تھا۔ اگرچہ خان آرزو کے علمی و ادبی ماحول کو دیکھ کر ان میں بھی علم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا ہوگا۔ لیکن وہ پریشان روزگار تھے۔ اور نہ ہی کوئی کفالت کرنے والا۔ اس زمانے میں ان کے دو ہمدرد اور دوست مل جاتے ہےں جن سے انہیں تحصیل علم میں مدد ملی۔ ایک عظیم آباد کے کوئی طالب علم میر جعفر اور دوسرے خوش گو شاعر سعادت علی امروہوی، سعادت علی نے ہی میر کو ریختہ میں شعر گوئی کا مشورہ دیا۔

میر کی حیات سے متعلق ایک ضروری امر یعنی ان کی خان آرزو سے علاحدگی ہے۔ یہ علاحدگی کیوں ہوئی کیا وہی عشق کا معاملہ تھا۔ جس کی طرف میر کے سوتیلے بھائی نے خان آرزو کو خط لکھ کر میر کی مدد نہ کرنے کا ذکر کیا۔ یا پھر میر کا شعیہ عقیدے کو تسلیم کر لینا، جس کی طرف محمد حسن آزاد نے بھی آب حیات میں اشارہ کیا ہے یا پھر کوئی اور وجہ۔ بہر حال میر اور خان آرزو کے تعلقات میں کشیدگی میر کی سوانح کا ایک اہم پہلو ہے۔ جس کی مزید تحقیق کی جانی چاہئے۔ یہ زمانہ ۱۱۶۰ھ کا ہے۔ کیونکہ جس رات خان آرزو نے میر کو کھانے پر مدعو کیا تھا اسی وقت دونوں کے مابین کچھ تلخ کلامی ہوئی اور میر کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مکان سے باہر نکل آئے۔ اور جامع مسجد سے ہوتے ہوئے حوض قاضی پر پہنچ گئے۔ جہاں پر علیم اللہ نامی شخص سے ان کی ملاقات ہوئی۔ بقول میر

''آن جا علیم اللہ نام شخصے پیش آمد و گفت شما میر تقی میر نہ باشید؟ گفتم از چہ شناختی؟ گفتا طور پر سودائیانہ شما مشہور است'' ۷

اسی علیم اللہ کی وساطت سے میر رعایت خان کے ملازم ہوئے اور انہیں فکر معاش سے کسی حد تک فراغت حاصل ہوئی۔

اٹھارویں صدی کا یہ دور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور بدحالی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ معاشی تباہی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ نادری حملے میں جان و مال کا بے پناہ نقصان ہوا تھا۔ نادری حملے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک لگا تار نو حملے کئے۔ یہ حملے معاشی نقصان کے ساتھ ساتھ قتل و غارت گری کا بھی سبب بنے۔ ان حملوں کے وقت میر دلی ہی میں تھے۔ لہٰذا یہ سب ان کے چشم دید حادثات تھے۔ جن کا احوال انہوں نے "ذکر میر" میں بھی بیان کیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کی افواج نے کئی بے گناہ معصوموں کو قتل کیا۔ آلات حرب کے ساتھ مال غنیمت حاصل کیا۔ عمادالملک نے احمد شاہ بادشاہ اور اس کی ماں کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادیں۔ میر نے اپنے ایک شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

ان بیرونی حملوں کی وجہ سے جو امرا میر کے سرپرست تھے وہ قتل ہوئے تو میر کے یہ سہارے بھی ختم ہوتے گئے۔ ان پر پھر وہی بے روزگاری اور مصیبت کے دن آ گئے۔ نواب بہادر جاوید خان کے قتل کے بعد میر پھر بے روزگار ہو گئے۔ لہٰذا وزیر کے دیوان مہانرائن نے اپنے ملازم سیر نجم الدین علی سلام کے ذریعہ میر کی خدمت میں کچھ رقم بھیجی اور میر نے ان کی ملازمت قبول کر لی اس طرح میر کچھ عرصے تک فراغت سے زندگی کرنے لگے۔ اس دوران پہلے ہی انہوں نے خان آرزو سے علاحدہ ہو کر امیر خان کی حویلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جس زمانے میں عمادالملک نے سورج مل جاٹ پر حملہ کیا۔ میر بھی اس سفر میں بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد کے سرداران دکن اور عمادالملک نے سورج مل جاٹ سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے تو بادشاہ احمد شاہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا، اس سفر سے واپس آ کر میر تقریباً گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد راجہ جگل کشور نے انہیں اپنے گھر بلایا اور اپنے اشعار پر اصلاح کے لئے مامور

کیا۔ یہاں پر میر کو کچھ عرصے تک فراغت حاصل ہوئی۔

احمد شاہ ابدالی کی مرہٹوں کے ساتھ جنگ پانی پت تاریخ ہند میں مرہٹوں کی شکست فاش کیلئے مشہور ہے۔ لیکن مغل حکومت کے فرماں رواؤں نے اس جنگ سے کچھ عبرت حاصل نہیں کی۔ وہ اپنی عیش پرستی میں محو رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے مرہٹوں نے اپنی طاقت کو مجتمع کرنا شروع کیا تھا اور پھر وہ دوبارہ شمالی ہند کی طرف پیش قدمی کرنے لگے تھے۔ کئی محاذوں پر انہوں نے حملے کئے۔ میر نے اپنی سوانح میں مرہٹوں کی اس یورش کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ آئے دن کی افراتفری اور بھگدڑ سے دلی کی حالت ابتر ہوگئی تھی۔ ایسی حالت میں یہاں پر گزران کی صورت نہیں تھی لہٰذا میر نے دلی چھوڑنے کا قصد کیا۔ وہ راجہ جگل کشور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دلی سے کہیں اور چلے جانے کا ذکر کیا۔ راجہ نے انہیں رخصت کیا۔ وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل پڑے۔ آٹھ نو کوس کا سفر کیا اور ایک سرائے کے درخت کے نیچے رات گزاری۔ اتفاقاً وہاں راجہ جگل کشور کی بیوی وارد ہوئی اس نے ان کی کچھ دستگیری کی۔

غرض دلی بیرونی حملوں کی وجہ سے کئی بار برباد ہوتی رہی، اور ان حملوں کی وجہ سے یہاں کے عوام کو در بدر بھٹکنا پڑا۔ بے شمار لوگ مفت میں اپنی جان گنوا بیٹھے۔ میر تقی میر بھی اس تباہی و بربادی سے متاثر ہوئے۔ ان کے بہت سے خیر خواہ اور سرپرست ختم کر دئے گئے تو یہ بھی خانماں برباد ہوئے۔ بہر حال آخر کار میر نے ہمیشہ کیلئے دلی کو خیر باد کہہ دیا اور نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ تشریف لے گئے۔ دلی سے ہجرت کے بارے میں میر لکھتے ہیں۔

''فقیر (میر) خانہ نشیں تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جاؤں مگر اسباب و وسائل کا فقدان قدم نہیں نکالنے دیتا تھا۔ میری عزت و آبرو کے تحفظ کیلئے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کو خیال آیا کہ میر میرے پاس نہیں آتا۔ نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو اسحاق خان نجم الدولہ کے چھوٹے بھائی اور وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے۔ ان پرانے روابط پر نظر کر کے جو میرے (سوتیلے) ماموں (خان آرزو) سے تھے، کہا ''اگر نواب صاحب از راہ عنایت زادِ راہ کیلئے کچھ مرحمت فرمادیں تو میر ضرور آئیگا۔'' حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے، انہوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے ایک خط لکھا ''نواب والا جناب تمہیں طلب فرماتے ہیں

جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ''۔ ۸؎

غرض میر سفر کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ پہنچے۔ پہلے ایک سرائے میں ٹھہرے، بعد ازاں نواب سالار جنگ کے گھر پہنچے۔ میر کے بیان کے مطابق وہ نواب سالار جنگ کے مکان پر چار پانچ دن تک رہے اور پھر نواب آصف الدولہ سے ان کی ملاقات مرغ لڑانے کے ایک مقابلے میں ہوئی۔ یہاں پر نواب سالار جنگ نے کہا کہ میر صاحب حسب الحکم حاضر ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کے مناسب کوئی جگہ انہیں عنایت کی جائے۔ بہر حال نواب آصف الدولہ نے انہیں اپنے ہاں ملازم رکھا اور ان کی سرپرستی کرنے لگے۔ نواب آصف الدولہ کی صحبت میں میر کے شب و روز اطمینان و آسائش سے بسر ہونے لگے۔ نواب آصف الدولہ کو شکار کا بھی شوق تھا لہٰذا میر بھی شکار کیلئے ان کے ہم سفر ہوتے تھے۔ میر نے دو شکار نامے اسی شکار کی روداد بیان کرنے کیلئے تحریر کئے ہیں۔ یہیں پر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کو میر نے وفات پائی۔ میر کا لکھنؤ میں کوئی انتیس (۲۹) سال تک قیام رہا۔

حواشی:

۱) میر تقی میرؔ ذکر میرؔ، صفحہ ۳۲ ترجمہ
۲) میرؔ تقی میر: ذکر میر، صفحہ ۳۴-۳۳
۳) صفدر آہ: میر اور میریات، صفحہ ۱۶
۴) نثار احمد فاروقی: تلاش میر، صفحہ ۵۷
۵) میر تقی میر: ذکر میرؔ، (ترجمہ) صفحہ ۸۷، نثار احمد فاروقی
۶) میر ذکر میر: صفحہ ۶۸ بحوالہ، صفدر آہ، میر اور میریات، صفحہ ۴۵
۷) میر تقی میر: ذکر میرؔ، (ترجمہ) صفحہ ۱۷۸، نثار احمد فاروقی
۸) میر تقی میر: ذکر میرؔ، (ترجمہ) صفحہ ۱۷۸، نثار احمد فاروقی

مثنویات میر کا تنقیدی مطالعہ

میر تقی میر اردو غزل کے عظیم تخلیق کار کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ولی اورنگ آبادی کی غزل گوئی کے اثرات کے تحت جب دہلی میں اردو شاعری کا رواج ہوا تو شاعروں نے غزل کی صنف کو ہی بنیادی وسیلۂ اظہار قرار دیا۔ لہذا دہلی کے دورِ اول کے شعراء نے بھی غزل کے مزاج موضوعات اور اسالیب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت کم عرصے میں غزل کے مختلف النوع اسالیب پیدا ہوئے۔ غزل کے موضوعات متعین تھے پھر نئے شعرا نے غزل میں اپنا نیا انداز اسلوب اور طرزِ اظہار اختیار کیا۔ اسی دور میں ایہام گوئی کا بھی رواج ہوا۔ ایہام گوئی دراصل زبان کے کثیر الجہت استعمال کا ایک ذریعہ تھا۔ اس میں بھی شعراء نے خوب طبع آزمائی کی لیکن اس طرزِ اظہار سے شاعروں کو احساس ہوا کہ ایہام گوئی محض ایک لفظی صنعت گری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور یہ شاعری کا حقیقی منصب نہیں ہے۔ لہذا شعراء نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ حاتم نے اپنے ضخیم دیوان کو مختصر کر کے ''دیوان زادہ'' مرتب کیا۔ ایہام گوئی کے اثرات میر کے کلام پر بھی مرتب ہوئے لیکن میر ایک وسیع ذہن اور بلند فکر کے شاعر تھے۔ وہ اس نوع کے شعری تجربات میں محصور ہو کر رہنے والے نہیں تھے۔ میر کے شعری اظہار میں زبان کا تصرف تمام امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ میر نے غزل میں اپنی ذاتی زندگی کے درد و آلام، اپنے زمانے کی ابتری، سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کی افراتفری، دلی پر بیرونی حملے، لوگوں کا قتل و خون، غرض اپنے دور کے معاشرہ کی حقیقی تصویریں پیش کی ہیں۔ بقول میر:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو چیز نظر آئی تصویر نظر آئی

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے ان کی سیر
کرتے ہیں باتیں میر جی کس کس مقام سے

ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو برابر ہے
یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

غرض میر تقی میر نے اردو غزل کو گہرائی، جذبہ و احساس کی شدت اور انسانی درد و کرب کے اثر انگریز اظہارات سے خوبصورت اور دلکش بنایا ہے۔ میر کا یہ تخلیقی کارنامہ اردو شاعری کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ میر کے اس غیر معمولی کارنامے کا اعتراف ہر دور کے اساتذۂ سخن نے کیا ہے۔ ناقدین ادب نے بھی اس کی تحسین شناسی میں اپنی اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے۔ آج بھی میر کی تازگی اظہار کی وہی اہمیت ہے جو اپنے دور میں تھی۔ میر کی شاعری سے متعلق آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''میر نے شاعری کو جولب ولہجہ دیا ہے اور صلابت کی بجائے لطافت پر توجہ آواز میں گونج اور گرج کی بجائے نرمی پر اصرار، جذبات کے تند و تیز بہاؤ کی بجائے ضبط و فغاں اور سازِ زیر لبی پر جو زور دیا ہے وہ بڑی بھرپور اور مستقل کیفیت رکھنے والی شاعری کا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ صرف انھیں چیزوں کو فن کی شاعری کی مستقل قدریں نہیں کہا جا سکتا۔ میر کے زمانے میں سیاسی انتشار، بدامنی اور نراج نے صراحت کی بجائے کنائے اور وضاحت کی بجائے اشارہ میں پناہ لی۔'' [1]

ایک منفرد اور عظیم غزل گو سے قطع نظر میر ایک اہم مثنوی نگار کی حیثیت سے بھی مقبول ہیں۔ غزل کے بعد مثنوی ہی وہ صنف ہے جس میں میر نے تفصیلی تخلیقی اظہار کیا ہے۔ اُن کی مثنویات داستانوی اور محض تصوراتی نہ ہو کر واقعی اور حقیقی اظہار سے مملو ہیں۔ بعض مثنویوں سے اُن کے عہد

کے واقعات وحالات کا بھی پتہ چلتا ہے اور بعض مثنویاں عشقیہ قصوں پر مبنی ہیں۔ ان عشقیہ قصوں میں بھی میر نے جدت اور واقعیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مثنویوں میں غیر فطری عناصر سے اجتناب برتا ہے۔ یہی حقیقت نگاری میر کی مثنویوں کا اہم وصف ہے۔ غرض انہوں نے مثنوی کو بھی بہت دلچسپی اور فنی بلندی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ اُن کی مثنویوں میں بے حد روانی اور دلکشی ہے۔ اُن کی مثنویوں کے موضوعات بھی متنوع ہیں۔ عبدالباری آسی کے مرتبہ ''کلیات میر'' میں تمام مثنویاں چار عنوانات کے تحت موجود ہیں جن کی ترتیب درج ذیل ہے:

۱) ستائش ہائے گوناگوں
۲) ہجویات
۳) مثنویات شکارنامہ
۴) مثنویات جذباتِ عشق

درج بالا عنوانات کے تحت چھوٹی بڑی کل ۳۱ مثنویات شامل ہیں۔ اس تحقیقی وتنقیدی مقالے میں ان تمام مثنویات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے اور ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے میر کی اہمیت وانفرادیت متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اگرچہ ان مثنویوں کا مطالعہ مختلف ناقدین پہلے بھی کر چکے ہیں لیکن تحقیق وتنقید میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ ہر نئے قاری کا مطالعہ یقیناً کچھ جدت رکھتا ہے۔ مثنویات میر کا یہ تنقیدی مطالعہ یقیناً دلچسپ اور اہم ثابت ہوگا۔ میر کی شاعری کو پڑھنا اور پھر اس پر خامہ فرسائی کرنا یقیناً مفید ہے۔ مذکورہ بالا جن عنوانات کے تحت مثنویاں درج ہیں اسی لحاظ سے اُن کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ستائش ہائے گوناگوں

اس عنوان کے تحت میر نے درج ذیل مثنویاں لکھی ہیں۔

۱) مثنوی در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر
۲) مثنوی در جشن ہولی وکتخدائی
۳) مثنوی در بیان ہولی
۴) مثنوی دیگر

۵) مثنوی دیگر

۶) مثنوی در تعریف سگ و گربہ کہ در خانہ فقیر بودند و باہم ربط داشتند

۷) مرثیہ خروس کہ در خانۂ فقیر بود

۸) مثنوی در بیان بز

ا۔ مثنوی در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر

بیرونی حملوں کی وجہ سے دہلی کئی بار اجڑتی رہی۔ سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے بھی یہاں پر مصیبتیں نازل ہوتی رہیں۔ ان بیرونی حملوں کی وجہ سے دہلی میں قتل وخون کا سلسلہ جاری رہا۔ معاشی بدحالی کی وجہ سے لوگوں کی رہائش ناممکن ہوگئی تو بہت سے لوگوں نے ترک وطن کیا اور معاش کی تلاش میں مختلف مقامات میں پھیل گئے۔ بہت سے شعراء نے بھی دہلی سے اپنا رقت سفر باندھا، لہذا مصحفی سودا میر سوز اور بعض معاصرین میر سے پہلے ہی لکھنو آ چکے تھے۔ یہاں پر نواب آصف الدولہ کا دربار آراستہ تھا۔ نواب آصف الدولہ نے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی خوب سرپرستی کی۔ میر تقی میر اب کسی شہرت کے محتاج نہیں تھے۔ ادبی حلقوں میں اب ان کا نام نہایت عزت واحترام سے لیا جاتا تھا۔ آخر کار میر نے بھی دہلی کو خیر باد کہا اور لکھنو چلے آئے۔ دربار آصفی میں میر کی خوب عزت وتوقیر ہوئی۔ اب میر واقعی آصف الدولہ کے دربار میں میر محفل بن چکے تھے۔ ہر مجلس اور ہر موقع پر میر نواب کے ہمراہ رہتے، لہذا میر کی لکھی ہوئی مثنویاں دربار آصفی سے میر کے تعلق کو واضح کرتی ہیں۔ زیر بحث مثنوی ''در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر'' بھی اسی تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔

جیسا کہ اس مثنوی کے عنوان سے ظاہر ہے یہ نواب آصف الدولہ کے شادی کے موقع پر لکھی گئی ہے۔ اس میں شادی کی دھوم دھام، روشنیوں کی چکا چوند، میلے تماشے، سیر وتفریح، مختلف نوعیت کی تقریبات کا بیان، بہت خوش فکری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہر طرف عیش وعشرت کا چرچا اور بے تکلف دوستوں کی محفلیں آراستہ ہیں۔ سارے جہان پر گویا بہار اور جوانی وسرمستی کی کیفیت طاری ہے۔ بقول میر:

نئے سر سے جواں ہوا ہے جہاں
عیش وعشرت کے محو خورد وکلاں

ہر طرف شہر میں ہے آرائش
رہرواں کی نہیں ہے گنجائش

شیشہ باز فلک ہے آتش باز
کہکشاں سے ہوا ہوائی ساز

ماہ سے ماہتاب کی ہے طرح
کس سے ہو لطیف روشنی کی شرح

ہر طرف دوست احباب ور معشوقان پری چہرہ عیش و عشرت میں سرشار ہیں اور جام و مینا کے دور گردش میں ہیں۔ غرض شادی کے اس جشن طرب میں ہر کوئی مسرور ہے اور سارا عالم ہی اس جشن میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور آخر میں کہتے ہیں

ساقیا دے وہ مے جو باقی ہے
شادی ایسی بھی اتفاقی ہے

ہو مبارک یہ جشن خوش انجام
دور گردوں بکام عیش مدام

آمغنی غزل سرائی کر
کچھ میر سے بھی آشنائی کر

غرض یہ مثنوی اس جشن شادی کو عیش و عشرت سیر تماشے اور تمام مجلس زندگی کے خوش گوار صحبتوں کو پیش کرتی ہے۔ زبان و بیان اور منظر نگاری کے لحاظ سے بھی یہ مثنوی ایک اہم شعری تخلیق ہے۔ اس سے بیانیہ شاعری پر بھی میر کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے۔

۲۔ مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی

یہ مثنوی بھی سابقہ مثنوی کی موضوعی توسیع ہے' مزید یہ کہ اس میں جشن ہولی بھی شامل ہے۔ ہولی چونکہ ہندوستان کا اہم تہوار ہے اس لیے اس سے متعلق ابتدا ہی سے منظومات لکھی جاتی رہی ہیں میر نے

بھی اسے اپنی مثنوی کا موضوع بنایا ہے۔ ہولی کے اس خوش گوار موقع پر شادیوں کا جشن طرب اور بھی زیادہ بہار آفریں بن گیا ہے بازاروں میں آرائش وزیبائش قابل دید ہے۔ ہر طرف میلے تماشے اور محفلیں آراستہ ہیں خوش ذائقہ کھانے لذت کام ودہن کے لیے حاضر ہیں۔ باغ اور سبزہ زار اپنی بہار پر ہیں اور لکھنؤ کا کوچہ وقریہ گویا جنت نشان کا سماں دکھا رہا ہے۔ مثنوی میں منظر نگاری کا یہ نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

دونوں رستے عمارت خوش ہے
تازہ کاری شہر دلکش ہے

اور بازاری رنگ لائے ہیں
سارے رنگیں ستوں لگائے ہیں

جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے
شہر ہے یا کوئی تماشا ہے

چشم بد دور ایسی بستی سے
یہی مقصد ہے ملک ہستی سے

لکھنؤ دلی سے بھی بہتر ہے
کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہے

آئیں بستہ ہوا ہے سارا شہر
کاغذیں گل سے گلستاں ہے دہر

بازاروں اور میلے میں لوگ شراب ناب سے شغل کر رہے ہیں معشوقان پری چہرہ کیساتھ چھیڑ چھاڑ کی جارہی ہے وہ بھی لگاوٹ اور عشق بازی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ مطرب ورقاص خوشی میں جھوم رہے ہیں۔ اس خوش اور پر بہار موسم میں باغ اور نہر کی سیر وتفریح بھی عجب لطف دیتی ہے۔ بقول شاعر:

سیر کریئے کنار نہر وگشت
لالۂ و گل کھلے ہیں تا سر دشت

انھیں پھولوں کے انعکاس سے آب
تو کہے لالہ رنگ سب ہے شراب

سبد گل ہوئی ہے ہر کیاری
ایک ہے گل زمیں زمیں ساری

درمیاں ایک شجر نہیں بد برگ
ہے ہزارہ کے لالۂ صد برگ

اس سیر چمن اور مرغ زار میں بہت سے نازنین اپنے دلبروں کے ساتھ پرلطف صحبتوں کا مزہ اٹھارہے ہیں او رپھر موقع جشن ہولی کا بھی ہے لہذا یہ عیش و نشاط اور بھی دو چند ہوگیا ہے۔ مختلف طرح کی نقلیں کی جارہی ہیں۔ سوانگ بھرے جارہے ہیں۔

کوئی جوگی کوئی فقیر بنا
کوئی ڈاڑھی لگا کے پیر بنا

کوئی بنیا بنا کوئی اوباش
نقل کرنی تھی ان سبھوں کی معاش

کوئی شاعر بنا نہ جس کی نظیر
جیسے مستغرق خیال تھا میر

کچھ سپاہی بنے تھے کچھ تجار
کوئی زاہد ہوا کوئی خمّار

جس کی تقلید کی سوویسی طرح
اصل ہوتی نہیں ہے ایسی طرح

کرکے سعی و تلاشی چاروں دانگ
خوب دیکھا تو ہے یہ عالم سوانگ

اس طرح جشن ہولی اور کتخدائی کے موضوع پر میر کی یہ مثنوی اپنے بیانیہ کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں پر مثنوی نگار نے منظر نگاری کے ذریعے خوبصورت مرقع کشی کی ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی متاثر کن ہے۔

۳۔ مثنوی در بیان ہولی

اس مثنوی میں بھی میر تقی میر نے نواب آصف الدولہ کے جشن ہولی کا نظارہ پیش کیا ہے۔ آصف الدولہ اپنے مصاحبین اور دیگر رفقاء کے ساتھ ہولی کھیلتے ہیں۔ اس موقع پر مختلف افراد ہولی کے جشن کو رقص و سرور اور نغمہ و نور سے خوب صورت بناتے ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں سے مہکے ہوئے گلزار کی سیر کرتے ہیں۔ خوبصورت اور پر بہار موسم نے اس جشن کو دلفریب بنا دیا ہے۔

دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں
جیسے گلدستہ تھے جوؤں پر رواں

زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس
عطر مالی سے سبھوں میں گل کر باس

رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھُہار
رنگ باراں تھا مگر ابر بہار

مرغ گلشن گلرخاں کو جان پھول
بیٹھتے ہیں پاس آ کر بھول بھول

اس نشاطیہ بیان کو پر کیف بنانے کے لیے روشنی اور چراغاں سے چکا چوند کے عالم کی منظر کشی کرتے ہیں۔ سیر دریا اور گلزار میں میں بھی چراغاں کی بہار دکھائی ہے۔ دریا میں کشتیوں کے ذریعہ چراغاں کیا جا رہا ہے۔ اس پر مستزاد آتشبازی اور توپوں کے داغنے سے بھی پر لطف سماں نظر آتا ہے۔ غرض در بیان ہولی میں میر نے تمام نشاطیہ لوازمات اور ضروریات کو حسب موقع شعر کے قالب میں پیش کیا ہے۔ اس مثنوی سے منسلک ایک غزل بھی ہے جو مثنوی کے موضوع سے ہم آہنگ ہے۔

۴۔ مثنوی دیگر

اس مختصر مثنوی میں میر نے ایک بندر کے بچے کی شوخیوں اور حرکتوں کا بیان کیا ہے۔ یہ بندر کا بچہ ایک درویش کے پاس تھا۔ اس نے حسب ضرورت اسے برائے فروخت میر کے پاس لا دیا۔ میر نے اسے ایک صاحب کو فروخت کیا۔ اور اس کی قیمت اس درویش کو ادا کی۔ اب اس بندر کے بچے کی شوخیاں اور اچھل کود سے سب لوگ دل بہلاتے ہیں۔ اس بیانیہ مثنوی میں میر کے مشاہدے اور جزئیات نگاری کا بھی پتہ چلتا ہے۔

حرکتیں دلکش ہیں سب انداز خوب
پر ضروری ہے کہ ہاتھوں میں ہو عیوب

ورنہ بوٹا سا جو قد ہے جھاڑ ہے
کٹکھنا نچنا ہے کپڑے پھاڑ ہے

لونڈی باندی سب کو اس سے احتراز
ڈرے اکثر بی بیو ں کے دل گداز

یہ جو چاہے چھوٹے تدبیر کیا
رسی ڈوری لوہے کی زنجیر کیا

ربط اسے جس سے ہے اس سے ربط ہے
مار کھانے پر بھی اس کو ضبط ہے

غرض اسی طرح اس کی شرارتوں اور حرکتوں کا بیان کیا ہے، اور پھر یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس کی تمام شرارتیں آدمی کی نقل جیسی ہیں اور سچ بھی ہے کہ بندر آدمی کی نقل کرتا ہے۔ غرض اس مثنوی میں میر نے اس کی تمام حرکتوں کا دلچسپ بیان کیا ہے۔

۵۔ مثنوی دیگر

اس مثنوی میں میر نے ایک بلی کی کہانی بیان کی ہے۔ موہنی نامی اس بلی نے میر کے گھر آ کر

قیام کیا، اور پھر اس نے شاعر۔ کے ساتھ ربط پیدا کیا۔ آگے پیچھے پھرنے لگی۔ کھانے پینے کو جو بھی حاصل ہوتا ہے اسی پر قناعت کرتی اور پھر رفتہ رفتہ وہ کوٹھوں پر جانے لگی کچھ عرصے بعد اس نے کئی بچے دیئے۔ لیکن وہ سب مر گئے۔ اس کے بعد اس کی خوب حفاظت اور دیکھ بھال کی جانے لگی۔
اب کی بار اس نے پانچ بچے دیئے بقول شاعر:

پانچ بچے اس نے اس نوبت دیئے
بارے سب وے قدرت حق سے جئے

کیوں نہ ایسی ہووے امدادترک بلی
بلائی بوہریرہ سب بزرگ

اک توجہ رکھے تھے ظاہر کی اور
آرزو برلائے یہ باطن کی زور

غرض بلی کے ان بچوں کی بھی خوب احتیاط اور حفاظت کی جانے لگی۔ سب لوگ ان کے ساتھ دل بہلاتے اور شوخیاں کرتے

آنکلتی تھیں جدھر یہ پانچ چار
وہ طرف ہوجاتی تھی باغ و بہار

ایک عالم عاشق وبیتاب تھا
ان کی خاطر بے خوروبے خواب تھا

لے گئے ایک ایک کرکے سب تین تو
منی مانی رہ گئیں مجھ پاس دو

منی کی پھر ایک صاحب نے پسند
تھی بھی نازک ایسی ہی طالع بلند

مانی کچھ بھاری تھی نکلی بردبار
رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار

اب یہ مانی شاعر کے ساتھ خوب مانوس ہوئی ہے۔ شاعر کے بوریئے پر ہی وہ اپنی خواب گاہ بنالیتی ہے۔ میر نے اس کی محبت شوخیاں اور دلچسپ حرکتوں کا بیان خوب کیا ہے۔ کہتے ہیں:

ربط ہے اپنے بھی جی کو اسکے ساتھ
بیٹھے ہی تو پیٹھ پر میرا ہے ہاتھ

ایک دن جاکر کہیں ٹک سوگئی
مانی مانی سارے گھر میں ہوگئی

بلی کا ہوتا نہیں اسلوب یہ
یہ کبودی چشم ایک محبوب یہ

دیکھے جسدم اس کو ذرا کوئی گھور
چشم شور آفتاب اس دم ہو کور

حسن کیا کیا مانی کے کریئے بیاں
ہو جہاں جب تک یہ ہووے درمیاں

غرض اس بلی کی بھی مختلف طرح سے تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے کبھی چوہا یا چڑیا نہیں کھائی اور پھر یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد من مانی نے بھی دو بچے دیئے ان کا نام سوہنی اور موہنی رکھا گیا۔ ان کی بھی خوب حفاظت اور نگہداشت کی جاتی ہے۔ غرض یہ مثنوی بھی میر کی بیانیہ شاعری کا بہترین شاہکار ہے۔ بلی جیسے جانور پر مثنوی لکھنا اور پھر ان کی افتادِ طبع ومزاج کا تجزیہ کرنا میر جیسے قادر الکلام شاعر کا ہی کارنامہ ہے۔ اور مختلف واقعات کے حوالے سے بیانیہ شاعری میں بھی میر لاثانی ہیں۔

۶۔ مثنوی در تعریف سگ و گربہ کہ درخانہ فقیر بودند و باہم ربط داشتند

اس مثنوی میں میر نے ایک مادہ سگ اور بلی کے ربط واتحاد کی کہانی بیان کی ہے۔ یہ دونوں

شاعر کے گھر میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ دونوں میں خوب محبت اور اتحاد ہے کھانا بھی ساتھ مل جل کر کھاتے ہیں۔ بلی بڑی ہوشیار اور توانا ہے اس نے تمام تمام چوہوں اور گھونسوں کا صفایا کردیا۔ مثنوی کے آغاز میں میر کہتے ہیں۔

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں
دو ہیں قالب اور ان کی ایک ہے جاں

رنگ گربہ سے شیر نر ہے داغ
آنکھیں اس کی اندھیرے گھر کا چراغ

کھائے نہ جو نہ ہو وہ مادۂ سگ
بھوکا بیٹھا رہے قیامت لگ

کب مرمت سے جائے کھانا چکھ
لڑے بھی ہے تو منہ پر پنجہ رکھ

غرض اس بلی کی ہوشیاری اور پھرتی وچالاکی سے سب واقف ہیں۔ اس طرح سے میر نے مادہ سگ کی بھی تعریف کی ہے یہ کہتے ہیں:

ہے جو وہ مادہ سگ تماشا ہے
دوڑ پڑنے کے وقت باشا ہے

کسی کے لقمے پہ نہ منہ ڈالا
سگ اصحاف کہف کی خالہ

اور آخر میں کہتے ہیں:

باہم اس کتے بلی کا یہ ربط
کوئی دیکھے نہ ہووے اس سے ضبط

کھو جاتا جو ہے کوٹھے پر
لگی رہتی ہے اس کچھت سے نظر

اور سے دشمنی جانی ہے
اس کی یہ باولی دوانی ہے

دونوں شوخی سے مارتے ہیں
سگ وگربہ کی چال رہتے ہیں

۷۔ مرثیہ خروس کہ در خانہ فقیر بود

موضوعی لحاظ سے یہ ایک مرثیہ ہے جسے میر نے اپنے پالے ہوئے ایک مرغ کی موت پر قلمبند کیا ہے۔ یہ مرثیہ مثنوی کی ہیت میں لکھا گیا ہے۔ ابتداء میں میر نے اس مرغ کی خوب تعریف کی ہے کہ یہ مرغوں کی لڑائی میں سیمرغ یا شترمرغ تک کا بھی صفایا کیے ڈالتا تھا۔ کہتے ہیں۔

نہیں ہے مرغ چمن میں جہاں کہ ایسا آج
برنگ کلہ تاج خروس سر پہ تاج

جو بیٹھے چھانھ میں پرواز پر سے مرغ خیال
کھڑا ہو دھوپ میں تو رشک مرغ زریں بال

کبھی جو صحن میں گھر کے وہ اشرف الطیّار
پھرا ہے کس کو ڈالے تو مرغ آتش خوار

اس طرح تمام قسم کے پرندوں کو تو اس مرغ نے پسپا کر دیا تھا لیکن ایک مادہ سگ سے اس کی دشمنی تھی اور آخر کار اس کے ساتھ لڑائی میں ہی یہ مرغ مارا گیا۔ بقول میر۔

خصومت اس کی تھی ایک مادہ سگ سے شام وسحر
کبھی وہ لات اسے مارتا کبھی شہپر

قضا جو پہنچی تھی نزدیک وہ بھی جھنجلائی
حریف ہو کے دلیرانہ سامنے آئی

یہ بھبھا تھا نہ سمجھا ادا کو کہنے کی
لگائی سامنے ہوتے ہی ایک سینے کی

ہلائی ان نے بھی گردن بگلی کہیں بے کل
کہ ایک دم میں گئی آہ اس کی گردن ڈھل

جھکا جو خاک کی جانب کس بیجاں کا
زمیں پہ تاج گرا ہدہد سلیماں کا

غرض اس طریقے سے اس بلند حوصلہ مرغ کا خاتمہ ہوتا ہے۔اس مرغ کی موت سے متاثر ہو کر دیگر پرندوں نے بھی کھانا پینا ترک کیا۔اس مختصر مثنوی میں میر نے بھی اپنی محبت ولگاؤ کو والہانہ انداز سے بیان کیا ہے اسی لیے اپنے غم کا اظہار مثنوی کے آخری شعر میں اس طرح کرتے ہیں۔

خموش میر تجھی کو نہیں یہ رنج و تعب
کباب آتش غم میں ہیں مرغ و ماہی سب

۸۔مثنوی در بیان بز

اس مثنوی میں ایک بکری کی تعریف وتوصیف بیان کی گئی ہے،یہ بکری مکمل سیاہ رنگت اور شوخ ہے اس کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے۔بقول شاعر۔

میں پڑھوں ہوں اس کے آگے شعر گہہ
اپنے ہاں گویا بزاخفش ہے یہ

بکروں کی ڈاڑھی کے تئیں جانے ہیں سب
تکہ رشی بکری کی ہے بوالعجب

رنگ سر سے پاؤں تک اس کا سیاہ
چکنی ایسی جس پہ کم ٹھہرے نگاہ

اس دوران بکری نے دو بکرے دیئے اب ان کی بھی دیکھ بھال کی جانے لگی۔ کچھ ذرا بڑے ہوئے تو گھاس پتے کھانے لگے۔ ہر وقت کود پھاند کرتے رہتے۔

گھاس دانہ بارے کچھ کھانے لگے
گرتے پڑتے پاس بھی آنے لگے

پرورش سے حق کی بارے جی گئے
آب و دانہ دوڑ کر کھاپی گئے

اب جوانی پر ہیں وہ شیر مست
کودتے ہیں ہر زماں ہر دم ہیں جست

غرض اس مثنوی میں کوئی ایسی مشکل یا پیچیدگی نہیں ہے صاف اور سلیس پیرائے میں بکری اور اس کے بچوں کی حرکتوں کا بیان ہے۔ اس سے میر کی قوت مشاہدہ اور کسی بھی موضوع پر قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔

ہجویات

ہجویات؛ اس موضوع کے تحت میر نے گیارہ مثنویاں لکھی ہیں۔ یہ مثنویاں مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ مثنوی در بیان مرغ بازاں

۲۔ مثنوی در ہجو خانہ خود

۳۔ مثنوی در ہجو خانہ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود

۴۔ مثنوی در مذمت برشکال کہ باراں در آں سال بسیار شدہ بود

۵۔ مثنوی در ہجو نااہل مسمی بہ زباں زد عالم

۶۔ ہجو عاقل نام نا کسے کہ بسگاں انسے تمام داشت

۷۔ مثنوی مسمی بہ تنبیہ الجہال

۸۔ مثنوی اژدر نامہ

۹۔ مثنوی در مذمت آئینہ دار

۱۰۔ مثنوی در ہجو اکول

۱۱۔ مثنوی دیگر در بیان کذب

۱۔ مثنوی در بیان مرغ بازاں

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ مثنوی لکھنؤ کی مرغ بازی کے معرکوں کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ لکھنو کے نوابوں میں مرغوں کی پالیاں لڑانا ایک مستقل مشغلہ تھا اور عوام الناس بھی اس میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ مرغوں کی لڑائی کے لیے انہی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ لہذا جب میر تقی میر دلی سے لکھنو آئے تو انہوں نے یہاں مرغوں کی یہ معرکہ آرائیاں دیکھیں کہتے ہیں۔

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے
پر خاش مرغ یاں پائے

پرو پرزا درست یکساں ہے
مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے

مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ
قازو سارس سے جنگ جس کا نہنگ

حوصلہ کس قدر حواصل کا
ذکر کیا کرگس شتر دل کا

غرض اسی طرح لکھنؤ میں مرغوں کی پالیاں منعقد کی جاتی تھیں۔ اس مثنوی میں بھی میر نے مرغوں کی پالیوں کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ مرغ ایک دوسرے کو زخمی کرتے ہیں کس طرح مرغ ایک دوسرے پر حملے کرتے ہیں اور مرغ باز کس طرح انھیں جوش دلا کر لڑاتے ہیں میر نے ان تمام جزئیات کی تصویر کشی کی ہے۔ مرغ کی لڑائی کا ایک منظر درج ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

جمعے منگل کو پالی کی ہے دھوم
گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم

مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش
جسکو دیکھو تو مرغ درآغوش

مرغ لڑتے ہیں ایک دولاتیں
سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں

ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے
ان نے کی نوک یہ پھڑکے لگے

وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج
ساتھ اس کے بدلتے ہیں کج دھج

غرض اسی طرح مرغوں کی اس لڑائی سے لوگ لطف اٹھاتے ہیں۔ اسی طریقے سے یہ لڑائی نصف النہار تک جاری رہتی ہے اور پھر اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوتے ہیں۔ یہ مثنوی مرغ بازی کے اہل لکھنؤ کے شوق وذوق کو واضح کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں لوگوں کا یہ ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ میر نے اس پر مثنوی لکھ کر لکھنؤ کی سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

۲۔ مثنوی در ہجو خانہ خود

اس مثنوی میں میر نے اپنے شکستہ اور کھنڈر نما گھر کا حال بیان کیا ہے۔ ایسا گھر جواب کسی بھی طرح سے رہائش کے قابل نہیں رہا لیکن مجبوراً اسی میں رہنا پڑ رہا ہے کہ اب دوسری کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ گھر کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک وتیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسف جاں ہے

کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ
کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ سے خم
تر تنک ہو تو سو کھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

غرض یہ گھر کسی بھی طرح سے بود وباش کے قابل نہیں ہے۔ موسم باراں میں چھت سے پانی ٹپکتا ہے۔ دیواریں شکستہ ہو چکی ہیں اور گھر کا کوئی بھی گوشہ محفوظ اور بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ ہر جگہ سے مٹی نکلتی رہتی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ گھر کو چوہوں اور گھونسوں نے کرید کر کھوکھلا کر ڈالا ہے۔ چھچھوندر، مچھر، جھینگر اور دیگر مختلف قسم کے جانور بھی اس مکان میں رہتے ہیں۔ کبھی سانپ بچھو، چھپکلی دکھائی دیتے ہیں تو کبھی مختلف قسم کے پرندے اس اُجڑے مکان میں آدھمکتے ہیں۔ بقول میر:

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جان محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ
کہیں کھسکی تو ہے قیامت ننگ

ایک دن ایک کوا آ بیٹھا
بے گماں جیسے ہوا آ بیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
کہ نہ حائط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
دوڑے اچھلے کہ ہال ہال چلے

نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا
ایک کالا پہاڑ آن گرا

غرض ہر لحاظ سے یہ گھر بوسیدہ خراب حال اور گرا پڑا ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ اطمینان اور سکون سے کوئی رہ سکے۔ دروازے ٹوٹے ہوئے، جس سے ہر وقت کتے بلی آ کر دھوم مچاتے ہیں۔ بارش کے موسم میں گھر کا صحن گویا تالاب بن جاتا ہے۔ بانس اور لکڑیوں کو جھینگر اور دیمک چاٹ گئے ہیں۔ اتنی بھی کشادگی نہیں ہے کہ کوئی بوریا پھیل کر بچھایا جا سکے۔ چھپر سے گھاس اڑتی رہتی ہے۔ بوریا یا کھاٹ بچھا کر رات کو سوئیں تو کھٹل ایک پل کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔ کھٹملوں کو مارتے ہوئے ہی رات گذر جاتی ہے اور پھر ایک مرتبہ اس گھر کی ایک دیوار گر گئی جیسے تیسے اس کی مرمت کی گئی اور اس کے ملبے کے نیچے جو لڑکا دب گیا تھا وہ بخیر زندہ رہا۔ پھر احباب نے یہ مشورہ دیا کہ اب اس گھر میں قیام نہ کیا جائے بلکہ کہیں اور بود و باش اختیار کی جائے لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی اور جگہ میسر نہ آئی۔ لہٰذا چار و ناچار یہیں پر رہنا پڑ رہا ہے۔ بقول میر:

شہر میں جا بہم نہ پہونچی کہیں
چار ناچار پھر رہا میں وہیں

اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ
اور میں ہوں وہی فرومایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس
خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس

قصہ کوتاہ دن اپنے کھوتا ہوں
رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کا ہے کا نام ہے گھر کا

غرض میر کی یہ مثنوی متاثر کن اور حقیقت حال کی منہ بولتی تصویر ہے۔ میر نے اس اجزے مکان کی کیفیت و ماہیت بڑے اثر انگیز اسلوب میں بیان کی ہے۔ گھر کا اجڑا پن اپنی جگہ، اس سے میر کی معاشی بدحالی کا بھی در پردہ اظہار ہوتا ہے۔ گھر کے اس بدحالی کے بیانیہ سے میر کی شخصی زندگی کی عسرت، تنگدستی، فاقہ کشی، بیروزگاری اور زمانے کی ناقدری کا بھی احساس ہوتا ہے۔ میر کی معاشی پسماندگی کو ذہن میں رکھیں تو اس مثنوی کی معنویت اور بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی اُن کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ غزل جیسی ایجاز و اختصار اور رمز و ایما کی صنف میں کمال کے علی الرغم مثنوی جیسی بیانیہ اور توضیحی صنف میں بھی میر کو اعلیٰ درجے کا کمال حاصل تھا۔

۳۔ مثنوی در ہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود

جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اس مثنوی میں بھی میر نے اپنے گھر کی ابتری اور بوسیدگی کو بیان کیا ہے جو شدت باراں سے مکمل خراب ہو چکا ہے اور جو، اب رہائش کے قابل نہیں رہا ہے جو ہر جگہ سے گر رہا ہے لیکن بہ مجبوری اس خرابے میں بود و باش ہے۔ بقولِ میر:

اب جو آیا ہے موسم برسات
دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات

صحن میں آب نیزہ بالا ہے
کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے

مینہ میں گھر کے پانچ چھ چھپر
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر

پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے
سوے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے

دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند
کہ جنھوں نے کئے ہیں جھانکے بند

غرض اس طرح جہاں سے دیکھئے گھر کی خرابی عیاں ہیں۔ جھینگر اور دیمکوں نے لکڑیوں اور بانس کو چاٹا ہے۔ بارش کی شدت کے سبب گھر میں بیٹھنے کے لئے بھی اب جگہ نہیں ہے، گویا لکڑیوں کے سہارے مچان بنا کر رہ رہے ہیں اور گلے گلے پانی میں کھڑے ہیں۔ شدت برسات سے دیواریں پانی میں ڈوب گئیں، چھت ڈھے گئی اور یہ سارا گھر گویا پانی میں دھنس گیا۔ بقول میر:

لے گیا پیچ و تاب پانی کا
کوٹھری تھی حباب پانی کا

یوں دھنسا گھر کہ بارِ خاطر تھا
آہ کس کا غبارِ خاطر تھا

اکھڑی دہلیز سب منڈیر گری
لہر پانی کی جھاڑو دیتی پھری

ساری بنیاد پانی نے کاٹی
اینٹ کے گھر کو کر دیا ماٹی

غرض یہ سارا گھر غرق آب ہوا، اب یہ طے پایا کہ کہیں اور چل کر رہیں، لہذا گھر کے افراد نے اسباب سمیٹا، اس حالت کو دیکھ کر گویا میر صاحب کی زندگی معیشت پر سب لوگ افسوس کرنے لگے۔ الغرض جو بھی سامان تھا وہ اٹھا کر ایک بھائی کے ہاں آ رہا اور جیسے تیسے زندگی جینے کا جتن کرنے لگے۔ بقول شاعر:

میر جی اس طرح سے آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

جن نے اس وقت آنکھ کو کھولا

ہنس کے بے اختیار وہ بولا

سن کے اس بات کو نرائے ہم
بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم

تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب
نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب

جس میں خوش یک نفس معاش کریں
طور پر اپنے بود و باش کریں

غرض یہ مثنوی بھی سابقہ مثنوی کی طرح اپنے گھر کی تباہی اور خرابی کو بیان کرتی ہے۔ میر کے ذاتی حالات جس بدحالی اور درماندگی کے شکار تھے اُسی کا حقیقی اظہار میرؔ نے اپنی ان مثنویوں میں بھی کیا ہے۔ میرؔ کی سوانح سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت ہی کسمپرسی، عسرت اور تنگ دستی میں مبتلا تھے، چونکہ کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا اور پھر کہیں سے کوئی امداد مل بھی جاتی، یا کوئی سہارا مل جاتا تو دہلی پر سیاسی حملوں کے سبب وہ سلسلہ بھی ختم ہو جاتا۔ خود دلی کئی بار لٹتی اور اجڑتی رہی، جو لوگ ذی حیثیت تھے وہ در در بھیک مانگنے کے لئے مجبور تھے۔ بقول میرؔ:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک جن کو دماغ تخت و تاج کا

دلی میں اب کے آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا
کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بدیر آئے

غرض دلی کی تباہی اور بربادی کے سبب بھی میرؔ کی زندگی آلام و مصیبتوں میں گھری ہوئی تھی۔ گھر کی بربادی و تباہی تو ایک طرف خود اُن کی زندگی کی حادثات کا شکار تھی۔ میرؔ نے ان سب کا بڑی جگر کاوی سے مقابلہ کیا اور حالات کے مقابل سینہ سپر رہے اور ایسی اعلیٰ پائے کی شعری تخلیقات یادگار چھوڑی ہیں جن کے مطالعے سے ایک نیا حوصلہ اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔ زیر بحث

مثنوی بھی میر کی زندگی کے حقائق پیش کرتی ہے اور خود ایک اعلیٰ پائے کی تخلیقی کاوش ہے۔

۴۔ مثنوی در مذمت برشکال کہ باراں در آں سال بسیار شدہ بود

اس مثنوی میں میر نے شدت باراں کا بیان کیا ہے۔ مسلسل اور شدید بارش کی وجہ سے زندگی بے حد متاثر ہوئی ہے۔ بارش کا سلسلہ کسی بھی طرح سے بند نہیں ہوتا۔ لہذا لوگوں کی زندگی ایک طرح سے غرق آب ہو گئی ہے۔ جہاں بھی دیکھیے سوائے بارش کے اور کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ بقول شاعر:

کیا کہوں اب کی کیسی ہے برسات
جوش باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوند تھمتی نہیں ہے اب کی سال
چرخ گویا ہے آب در غربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے
آسماں چشم واکو ترسے ہے

ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں
تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں

غرض شدت باراں کا یہ عالم ہے کہ سارے عالم میں گویا پانی بھر گیا ہے۔ لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ زندگی کے سارے کام یکلخت بند ہو گئے ہیں۔ لوگوں کا گھر سے باہر نکلنا مشکل ہے دیگر جاندار بھی شدت باراں سے متاثر ہیں۔ لوگوں کے مکانات گر گئے ہیں۔ زراعت کی فصل تباہ ہو چکی ہے۔ خشکی کے جانور بھی گویا اب بحری بن گئے ہیں۔ بقول شاعر:

مست ہو ہو گئے ہیں مست شراب
غوطے کھاتے پھرے ہیں عالم آب

مستی ہے اب جو چاہیں سیر آبی
بط مے تو ہوئی ہے مرغابی

دستِ غم اس قدر بہ طغیاں ہے
کہ ہر اک گوشہ بیچ طوفاں ہے

سیل دیکھے ہے کوہ سار انکی
لئے کشتی گدا ہیں باران کی

جزر و مد جس کا تا فلک جا ہے
جو ہے تالاب قہر دریا ہے

ہر طرف ہیں نظر میں ابرِ سیاہ
پانی ہے جس طرح کو کریئے نگاہ

غرض اس مثنوی میں میرؔ نے شدت باراں کی تباہی و بربادی کا بیان متاثر کن انداز میں کیا ہے۔

۵۔ مثنوی در ہجو نا اہل مسمّی بہ زبان زدِ عالم

اس مثنوی میں میرؔ نے کسی ایسے شخص کی ہجو لکھی ہے جو اُن کے ساتھ عداوت رکھتا تھا اور اُن کی برائی کرتا تھا۔ مزید یہ کہ وہ میرؔ سے دعوئ شاعری بھی کرنے لگا تھا۔ اگر چہ میرؔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کی اس حرکت کو بہت ضبط کیا اور بے وجہ کسی کی ہجو لکھنا اُن کا طور نہیں ہے لیکن اس نا اہل کا جواب دینا ضروری ہوگیا تھا۔ میرؔ کہتے ہیں:

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار
کن دنوں تھا ہجو کرنا شعار

گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا
ہجو اس کی ہوگئی اس کا کہا

کیاہوا گر چاند پر پھینکے ہیں خاک
پڑتی ہے اُن سب کے منہ پر میں ہوں پاک

رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ
مدعی بے ہیچ ہے یہ رو سیاہ

میؔر کہتے ہیں کہ اگر چہ سارا عالم میری قدر ومنزلت کرتا ہے۔ میری شاعری کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں ہے اور کتنے ایسے ہیں جو مجھ سے شاعری کے اسرار و رموز سیکھتے ہیں اور بے شمار لوگ میرے فکروفن کے معترف ہیں:

سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

غرض اس ہجو میں میؔر نے بھی دل کھول کر اس کی مذمت کی ہے اور رکیک اور مبتذل انداز میں بھی اس کی برائی بیان کی ہے اور گویا عزم اور حوصلے سے اس کے ساتھ برسر پیکار ہیں اور یہ کہ اب اس طرح خاموشی اور شرافت سے اب کام نہیں چلے گا بلکہ ہر ممکن طریقے سے اس کے مدمقابل میدان میں اترنا چاہئے۔ بقول میؔر:

چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا
پاس کب تک کیجئے نام و ننگ کا

یاں زبردستوں کو دعویٰ کھا گیا
یہ چھپا رستم کہاں سے آ گیا

ناقباحت فہم کو دعوے بڑا
ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے
چونٹی کا کیا جگر جو منہ پہ آئے

جنگ ہاتھی کی ہو گو اس کو ہوس
پر اسے ہے موت کا ریلا ہی بس

غرض حسد اور رقابت سے اس نے میؔر کی ہجو لکھی اور بے وجہ خصومت پیدا کی لیکن میؔر جیسا نازک مزاج اور قادر الکلام شاعر یہ کب برداشت کرے گا۔ میؔر نے بھی اس کی ہجو میں وہ زور قلم دکھایا کہ اس کی ذات شخصیت اور ابا وجد کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیئے تا پھر کبھی ایسی گستاخانہ جرأت نہ کر سکے۔

۶۔ ہجو عاقل نام نا کسے کہ بسگاں انسے تمام داشت:

میر نے یہ مثنوی دراصل سودا کی ہجو میں لکھی ہے۔ سودا کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ اُن کے شب و روز کتوں کے ساتھ ہی بسر ہوتے تھے۔ کتوں کو ساتھ لے کر کھانا کھاتے ہیں۔ میر کہتے ہیں کہ کتوں کے ساتھ ایسا حد درجہ شغف کسی نے نہیں دیکھا اور پھر کتا تو ایک ناپاک جانور ہے۔ بقول میؔر:

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش
چچڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی طبع و لطافت برطرف
کتا بغل میں مارے لگا پھرنے ہر طرف

دنکا روکتے کو تو لہو اپنا وہ پئے
ہے اس کی استخواں شکنی کتوں کے لئے

یا جھوٹے ہاتھ کتے کو مارا نہ تھا کبھی
یا کتوں سے چٹایا ہے اب اپنے منھ کو بھی

غرض میؔر کہتے ہیں کہ یہ شخص کتوں کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ ہر وقت اس کے آگے پیچھے کتے لگے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ کتا ایک نجس جانور ہے۔ اگر چہ اصحاب کہف کا کتا بھی کتا ہی کہلاتا ہے، کتا خواہ کسی بھی جگہ کا ہو اور کیسی ہی بڑی ہستی کے پاس ہو بھی اہل اسلام کتے کو ناپاک جانتے ہیں۔ مثنوی کے آخر میں میؔر کہتے ہیں:

توراں کے لوگ ہوویں کہ ہوں اہل اصفہاں
کتا تو کشتنی ہے سب اسلامیوں کے پاس

جس کو خدا خراب کرے پھر وہ کیا کرے
کیونکر زباں نکالے نہ جوں سگ بھرا کرے

آواز دے دے کتوں کو توڑے ہے اپنی جان
مر جائے گا یہ بھونکتے ہی بھونکتے ندان

غرض میؔر نے اس مثنوی میں کتوں سے دردرجہ لگاؤ کے نتیجے میں سودا کی ہجو کہی ہے اور اس مثنوی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے انسانیت کے مرتبے سے نہیں گرنا چاہئے کیونکہ کتا تو بہر حال ایک نجس اور ناپاک جانور ہے اور کوئی شخص اگر اس طرح کتوں کے ساتھ ہی اپنے شب و روز بسر کرے تو پھر ایسا شخص آدمیت کے منصب سے گر جاتا ہے اور اس کی کوئی عزت و توقیر نہیں ہوتی۔ اگر چہ یہ مثنوی ایک ہجو یہ موضوع پر مبنی ہے لیکن مجموعی لحاظ سے یہ مثنوی ایک کامیاب شعری تخلیق ہے۔ اس کے بیانیہ اسلوب میں بھی روانی اور دلچسپی پائی جاتی ہے۔

۷۔ مثنوی مسمیٰ بہ تنبیہ الجہال

یہ مثنوی دراصل شاعری کی عظمت و رفعت اور اس کی فنی لطافت کے بارے میں کہی گئی ہے۔ کسی زمانے میں یہ فن شریف کہلاتا تھا کیونکہ فنون لطیفہ اور شعر گوئی طبقہ خواص اور اشراف تک ہی محدود تھا اور ہر کس و ناکس اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا جیسا کہ مثنوی کی ابتدا میں میؔر کہتے ہیں:

صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف
کسب کرتے تھے جن کی طبعیں تھیں لطیف

تھے ممیز درمیاں انصاف تھا
خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا

دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو
کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو

تھے جو اس ایام میں استاد فن
ناکسوں سے دے نہ کرتے تھے سخن

پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دیں
کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں

غرض شاعری جیسے فن لطیف سے اشراف ہی بہرور ہوتے تھے لیکن پھر دھیرے دھیرے ہر کوئی اس فن میں دخل در معقولات کا مرتکب ہونے لگا اور کچھ معمولی فہم کے لوگوں نے بھی اجلاف کو شعر گوئی کی طرف راغب کیا۔ پھر یہ سطحی اور فرومایہ لوگ شعر گوئی میں بھی اپنی استادی اور فنکاری کا دعویٰ کرنے لگے۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے شاعری میں عامیانہ پن اور سوقیانہ پن پیدا ہوا اور ایسے لوگوں کی پشت پناہی کرنے والے بھی ان کی تعریف وتوصیف کرنے لگے۔

کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن
آگے استادوں کے ہو گرمِ سخن

اُن کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا
صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا

وہ سراپا جہل ناگہہ وقت کار
ہم سے تم سے کرنے لگا اعتذار

سر میں رکھ کر دعوی طبع لطیف
میر و مرزا کا ہوا آخر حریف

غرض میر کہتے ہیں کہ اس طرح کے کم مایہ لوگ بھی شعر وسخن کا دعویٰ کرنے لگے۔ اس مثنوی میں میر نے اصفہان کے ایک وزیر کی حکایت بھی بیان کی ہے جو شعر وسخن کا قدر شناس

تھا۔ ایک دن اس کے دربار میں ہلالی نامی ایک شاعر باریابی کا طالب ہوا۔ وزیر نے اس کی عزت و تعظیم کی۔ دوران گفتگو جب شعر و سخن کا ذکر چھڑا، ہلالی نے شعر خوانی کے دوران غلط اشعار سنائے اسی وقت وزیر اصفہان اس پر برافروختہ ہوا اور اس نے ملازموں کے ذریعے ہلالی کو کافی زدوکوب کیا اور خوب مار کھلائی۔ اس واقعے سے ہلالی کافی متاثر ہوا۔ لہذا اس نے خود کی اصلاح کی کوشش کی اور کسی عظیم استاذ کی شاگردی کا طالب ہوا، لہذا وہ مولوی جامی سے مشورۂ سخن کرنے لگا۔ بقول میرؔ:

پس مجھے ہے تربیت اپنی ضرور
جا کے بیٹھوں اک سرآمد کے حضور

صحبت اکثر رکھوں اس استاد سے
شاید اس کی دولت ارشاد سے

پہونچے اک رتبے کو میری قیل و قال
ہو مجھے اس فن میں اگر گونہ کمال

اُٹھ کے آیا مولوی جامی کنے
مشق کی اک چند اس نامی کنے

جب ہوا کچھ شعر کا رتبہ بلند
اور مولانا لگے کرنے پسند

بعد ازآں جب وہ دوبارہ وزیر اصفہان کے حضور حاضر ہوا۔ باریابی ہوئی اور اس نے وزیر موصوف کی مدح سرائی کی، اب کی مرتبہ اس کی خوب قدر و منزلت کی گئی۔ غرض اس طرح میرؔ نے اس مثنوی میں ایسے لوگوں کی تنبیہ کی ہے جن کو شعر و سخن سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن وہ اساتذہ کی ہمسری کرنے لگتے ہیں۔ مثنوی کے آخر میں میرؔ کہتے ہیں:

کون حرفِ خوب کو کرتا ہے گوش
بات کی فہمید کا ہے کس کو ہوش

بے تمیزوں سے بھرا ہے سب جہاں
ہے دماغ حرف ہم کو بھی کہاں

اس طرح میرؔ کی یہ مثنوی فن کی قدر و منزلت اور اس کی قدر شناسی کا اظہار ہے۔ جسے میرؔ نے بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

۸۔ مثنوی اژدر نامہ

میرؔ جس بلند پایے کے شاعر تھے اس کا احساس خود میرؔ کو بھی تھا۔ انہوں نے اس کا اظہار مختلف غزلیہ اشعار میں بھی کیا ہے اور میرؔ کو جو خدائے سخن کہا جاتا ہے تو دراصل ان کے اس عظیم شعری مرتبے کی بنا پر ہی کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ میرؔ جیسا قادر الکلام ہر کوئی نہیں ہوتا۔ یہ اردو زبان و ادب کی خوش نصیبی ہے کہ غزل کی نشو و نما کے ابتدائی زمانے میں ہی میرؔ جیسا شاعر پیدا ہوا، جس نے غزل اور اردو شاعری کو عظیم مرتبہ عطا کیا۔

دراصل میرؔ کی سوانح کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے، میرؔ نے جو رنج و الم اٹھائے، جس درد و کرب اور محرومی و ناکامی کا سامنا کیا، ان تمام سانحات نے انھیں ایک بلند حوصلہ اور جری انسان بنا دیا۔ عشق میں ناکامی کے سبب وہ جنون کے بھی شکار ہوئے لیکن ان سب کے باوجود انھیں ایک بلند پایہ شاعر ہونے کا شدید احساس تھا۔ یہ احساس ایک طرح کے تکبر اور غرور کے درجے تک پہنچ چکا تھا۔ مذکورہ مثنوی میں بھی میرؔ کا یہی رویہ ظاہر ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے خود کو ایک خوفناک اژدر کہا ہے اور باقی تمام شاعروں کو جانور، کیڑے مکوڑے، لومڑی، چوہا، گرگٹ، مینڈک، پرندے اور دیگر حشرات سے تعبیر کیا ہے۔ شیر اور دیگر خونخوار جانور تک اژدر سے خوف کھاتے تھے اور اس کی راہ میں ہرگز نہ آتے تھے۔ بقول میرؔ:

حکایت بعینہ یہ دل سے ہے میرؔ
سرِ راہ کہتا تھا جو اک فقیر
کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم
درندوں کے بھی دل تھے اس سے دو نیم

نکلتے نہ تھے اس طرف ہوئے شیر
پلنگ و نمرواں نہ رہتے تھے دیر

جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب
شغال اور روبہ کا واں کیا حساب

وہ صحرا تھا اس کے سبب ہولناک
دم اس کے نے واں کی اڑا دی تھی خاک

آگے مزید کہتے ہیں:

صدا جب مہیب اس کی ہوتی بلند
جگر چاک گرتے ہوا سے پرند

درندوں کے بر جانہ رہتے حواس
چرندے مکانوں سے ہوتے اداس

وحوش اس بیاباں میں جاتے نہ تھے
طیور آشیانوں میں آتے نہ تھے

کبھو اس کی راہ میں جو اٹھتا غبار
تو وہ دشت تھا ایک تاریک غار

غرض اسی طرح سے وہ اپنی ہیبت ناکی اور دہشت ناکی کا اظہار ایک اژدر کی مانند واضح کرتے ہیں، جس سے سارے چرند پرند درند خوفزدہ ہیں۔ اسی طرح گویا وہ اقلیم شعر کے اژدر ہیں اور باقی سارے شاعر کیڑے مکوڑے اور فرومایہ جانور ہیں۔ جو اژدر کے سامنے کب ٹھہر سکتے ہیں۔ جیسے اژدر کے ڈر و خوف سے سارے جاندار سہمے ہوئے ہیں ویسے ہی میؔر کے خوف سے سارے شعرا خوفزدہ ہیں۔ بقول میؔر:

مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ
طرف ہوں مری اُن کی طاقت ہے یہ

جو مجھ کو ہو کچھ بھی انہوں کا خیال
تو یہ مار گیری کریں کیا مجال

تو کیاہوا انہوں سے بہت دور میں
ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں

مری قدر کیا اُن کے کچھ ہاتھ ہے
جو رتبہ ہے مرا مرے ساتھ ہے

کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

۹۔ مثنوی در مذمت آئینہ دار

یہ مثنوی حجام فرقے کی ہجو میں کہی گئی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ یہ سفلہ اور بے حیثیت فرقہ بھی شاعروں کی تقلید میں گویا اب شعر گوئی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ حالانکہ انھیں شعر گوئی اور اس طرح کے فن لطیف سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور نہ ہی تہذیب و شرافت میں ان کو دخل ہوتا ہے اور نہ ہی گفتگو کے آداب سے یہ واقف ہوتے ہیں۔ میرؔ کہتے ہیں:

لکھیے اس فرقے کے اب تاچند ذم
خط بنا دیں ایسا کریئے کف قلم

گرچہ ان کو کہتے ہیں آئینہ دار
لیک ان کا منہ نہ دیکھیں کاش بار

صاف قینچی پر انھیں چڑھوایئے
گر نمد مو اس میں پھر ہو جایئے

چاہو ہو اس قوم کی کیا شرح حال
آگے ہی آویں گے جتنے ہونگے بال

اک سفید اُن کو نہیں چننے کی تک
۔وتے ہیں دشمن یہ کالے بال تک

کیا کہوں کیسے ہیں اوندھے یہ لچر
کیجئے اصلاح عائد ہووے شر

غرض اس فرقہ کی بداطواریوں کا ذکر کرتے کرتے مثنوی میں کچھ ابتذال بھی پیدا ہوا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میرؔ نے اس فرقے کے سوقیانہ پن اور پھکو پن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرؔ کو شاید اس فرقے کے لوگوں سے کچھ نازیبا تجربہ ضرور ہوا ہوگا۔ مثنوی کے آخر میں کہتے ہیں:

چھیڑیو تو مغز بھی لے جائیں گے
سر کے تیئں سہلا کے بھیجا کھائیں گے

بے حقیقت ہیں نہیں شایانِ کار
صحبت اُن سے بگڑی ہے پایان کار

۱۰۔ مثنوی در ہجو اکول

اس مثنوی میں میرؔ نے ایک ایسے شخص کی ہجو لکھی ہے جو بسیار خوراک تھا۔ اس کا شکم گویا صدمنی دیگ کے مساوی تھا اور اس کا نفس گویا اژدہے کی پھنکار جیسی تھی۔ دیکھنے میں بدہیئت اور ترش رو تھا۔ ہمہ وقت اس کی طبیعت کھانے کے لئے للچاتی تھی۔ بقول میرؔ:

کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے
چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

وقت کھانے کے ہاتھ سے اس کا
قاب پر نان پنجہ کش گویا

کیا وہ دو پیازہ کھا کے ہو تازہ
اک نوالا ملا ہے دوپیازہ

گوشت ہانڈی بھرا ہے خنک میں
ہنڈیاں گویا تھیں اس کی خشتک میں

کھانا کھانے کے لئے وہ جس طرح ٹوٹ پڑتا ہے، میرؔ نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ کہتے ہیں:

کھانے پر جب وہ جی جلاتا ہے
لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہے

نہیں پہونچے جو کھانا کھانے لگ
ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ

بھوکھ کا باؤلا جو آتا ہے
لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے

میرؔ مزید کہتے ہیں کہ جب وہ بازار سے گزرتا ہے تو اسے دیکھ کر لوگ سودوں کی خریداری کرتے ہیں۔ دکاندار اپنی دکان بند کردیتے ہیں۔ سبزی فروش اپنی دکانوں کو ڈھانپتے ہیں اور بنئے بیوپار سب محتاط ہو جاتے ہیں، جانے یہ کیا چٹ کر جائے۔ میرؔ نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن انہوں نے اس کی میزبانی کی، گھر میں جو کچھ تھا اسے بیچ کر اس کے لئے کھانا پکوایا، اس جنم کے بھوکے نے سب کچھ ہضم کردیا، اس کا احوال میرؔ کی ہی زبانی سنئے:

گھر میں جو کچھ تھا بیچ منگوایا
کھانا اس کے لئے میں پکوایا

کتنا کھانا بیاں کروں تجھ سے
جس پہ سو مہماں کروں تجھ سے

مجھ سے تھی روزگار سے ان بن
خوب کھانا تو تجھ پہ ہے روشن

چار من گاجروں کا قلیہ تھا
وہ منی دیگ بیچ دلیہ تھا

روٹیاں کس قدر بتاؤں میں
جس کو دو چار سال کھاؤں میں

میرؔ آگے مزید لکھتے ہیں:

کھانا کوئی اور کیا کہے اس کا
سارے منھ دیکھتے رہے اس کا

جب مرے گا وہ بھوک کا روگی
روح توشے کی روٹی میں ہوگی

کھانے کی بو جو ناک میں بیٹھے
مر گیا ہووے تو بھی اٹھ بیٹھے

عقل باور اگرچہ کرتی نہیں
وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں

بھوکے اس کا جو جی نکل جاوے
گور میں بھی کفن نگل جاوے

اس طرح مذکورہ مثنوی میں میرؔ نے ایک بسیار خور شخص کی ہجو تفصیل سے لکھی ہے۔ اس کی اس عادت کی وجہ سے بہت سے لوگ پریشان تھے۔ اس مثنوی کے ذریعے میرؔ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ

آدمی کو اپنے معاملات میں اعتدال سے کام لینا چاہئے اور اپنی شخصیت میں توازن قائم رکھنا چاہئے۔

۱۱۔ مثنوی دیگر در بیان کذب

یہ مثنوی میرؔ نے جھوٹ کو مخاطب ہو کر لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ شہر میں لوگوں میں ہر طرف جھوٹ کا چلن نظر آتا ہے۔ گویا زندگی کے چھوٹے یا بڑے کوئی بھی کام جھوٹ کے بغیر انجام نہیں پاتے۔ کچھ لوگ مصلحتاً جھوٹ بولتے ہیں کچھ صریحاً دروغ گوئی کو ہی اپنا شعار بناتے ہیں اور اس میں شاہ و گدا امیر و غریب کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے جسے دیکھئے دروغ گوئی کو ہی اپنا شعار بنا رہا ہے۔ کچھ ایسے ہیں کہ اس کو چالاکی اور ہوشیاری گردانتے ہیں پھر جھوٹ بول کر لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ بقول میرؔ:

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا سب کا یہی طور ہے

اے جھوٹھ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شہہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا

اے جھوٹ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے
اے جھوٹ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے

اے جھوٹ رفتہ رفتہ ترا ہوگیا رواج
تیری متاع باب ہے ہر چار سو میں آج

اے جھوٹ کیا کہوں کہ بلا ریز سر ہے تو
اے جھوٹ سچ یہ ہے کہ عجب فتنہ گر ہے تو

اے جھوٹھ کب ہے عرصہ میں تجھ سا حریف اب
تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب

اے جھوٹھ تیرے شہر میں ہیں تابعیں سبھی
مر جائے کوئی کیوں نہ کوئی دے سچ بولیں نہ کبھی

غرض اسی طرح سے لوگوں میں جھوٹ کا چلن عام ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے لوگوں کو دھوکے دیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں، گھر برباد ہوتے ہیں، کسی کی جھوٹی گواہی سے کوئی عدالت میں ماخوذ کیا جاتا ہے۔ قید و بند کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ فتنے اور فساد برپا ہوتے ہیں۔ لوگ قتل کئے جاتے ہیں۔ کسی کا روزگار چھن جاتا ہے، لوگ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، کسی کام کے لئے جھوٹ بول کر بے سبب انتظار کرواتے ہیں۔ بقول شاعر:

اے جھوٹھ اس طرح ہیں بہت جی سے جا چکے
وعدوں میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آ چکے

اے جھوٹھ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش
ہے تنگ جھوٹھ بولنے سے عرصۂ تلاش

سرِ دار جس سے سب متعلق ہے کاروبار
سچ بولنا ہے اس کے تئیں سخت ننگ و عار

اس مثنوی میں میرؔ نے اپنا بھی ایک تجربہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ کسی ایک شخص کے پاس اُن کی کوئی ایک درخواست تھی لیکن اس پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ غرض اس سے جب اس کی بابت پوچھا گیا تو اس نے اس طرح جواب دیا:

تقصیر میری اس میں نہ کریگا کچھ خیال
صاحب کہیں خموشی کروں میں یہ کیا مجال

لیکن یہ حرف اس بھی سیہ روکا رکھئے یاد
انداز سے یہ لوگ سخن کرتے ہیں زیاد

بہتری ایسی فردیں یہ رکھتے ہیں جیب میں
رکھتے ہیں یونہی لوگوں کو برسوں فریب میں

دکھلاؤں گا چلا ہوں سوال آپ کا لئے
میں نے کہا فقیر کہو کس طرح جئے

لیکن آخر کار اس فرد دستخطی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اسی طرح وعدے کئے جاتے ہیں اور کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ غرض یہ مثنوی لوگوں کے جھوٹے رویئے اور فریب کاری کے عمل کو پیش کرتی ہے۔ میرؔ نے معاشرے کے اس اخلاقی زوال اور پستی کو اجاگر کیا ہے۔ خود غرض اور موقع پرست لوگوں کے پاس انسانی ہمدردی ختم ہو جاتی ہے اور پھر جھوٹ اور فریب کاری ہی اُن کا شعار ہو جاتا ہے۔ میرؔ کی یہ مثنوی اخلاقی اصلاح کا بھی درس دیتی ہے۔ اخلاقی شاعری کے لحاظ سے میرؔ کی یہ ایک کامیاب مثنوی ہے۔

مثنویات شکارنامہ

۱۔شکارنامہ اول:

شکارنامہ اس موضوع پر میر نے دو مثنویاں لکھی ہیں۔ شکارنامہ اول اور شکارنامہ دوم۔ دلی سے ہجرت کے بعد میر جب لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ چونکہ لکھنؤ میں اطمینان سکون اور فراغت حاصل تھی اس لئے سیر و تفریح اور شکار جیسے مشاغل نوابوں کی دلچسپی کا ذریعہ تھے۔ آصف الدولہ سے مصاحبت کے نتیجے میں میر بھی شکار کے لئے اُن کے ہمراہ رہتے تھے۔ دراصل انہی تجربات مشاہدات اور واردات کا نتیجہ یہ مثنویاں ہیں۔ شکارنامۂ اول میں شکار کی روداد تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں کسی حد تک مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے، جیسے ہی آصف الدولہ شکار کے لئے جنگل میں داخل ہوتے ہیں جنگل میں گویا بھونچال آ جاتا ہے۔ تمام جانور دہشت اور خوف سے سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ پرندے بھی ڈر اور خوف سے سہم کر اپنے آشیانوں کو چھوڑنے لگے۔ مثنوی کی ابتداء میں میر کہتے ہیں:

چلا آصف الدولہ بہر شکار
نہادِ بیاباں سے اٹھا غبار

روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ
لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ

طیور آشیانوں سے جانے لگے
وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

سن آواز شیران نر ڈر گئے
پلنگ و نر خوف سے مر گئے

آگے مزید لکھتے ہیں:

نہ دیکھا نہ ہم نے سنا یہ شکار
کہ بکری سا ہاتھی کو لیتے ہیں مار

پلنگان صحرا کے دل خوں کئے
نہنگان دریا ہوئے مر جئے

کہاں سہل مارے گئے نرہ شیر
لگے بکریوں کو پکڑتے بھی دیر

غرض اس طرح شیر، چیتے، ہاتھی اور سارے جانور بھیڑ بکریوں کی طرح مارے گئے۔ مرغ و ماہی کے شکار میں بھی خوب دلچسپی اور خوشی حال ہوئی۔ میؔر کہتے ہیں:

کروں صید ماہی کا کیا میں بیاں
کہ فیلوں پہ تھے تودہ تودہ رواں

پڑے سیکڑوں دام تالاب میں
نہ چھوٹی تنک خاک اس آب میں

نہ تیتر نہ طاؤس صحرا کے بیچ
نہ ماہی نہ مرغابی دریا کے بیچ

رہے گوشت ہی پکتے ہر صبح و شام
جواں کھا گئے مرغ و ماہی تمام

ہوا حائل راہ بحر عمیق
کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق

قریب آکے اتری یہ خائف تھی فوج
کہ بے ڈول اٹھتی تھی ہر ایک موج

بہر حال اس عمیق و عریض دریا کو دیکھ کر سب حیران رہ جاتے ہیں لیکن نواب آصف الدولہ اسے دیکھ کر فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیتے ہیں اور پھر کچھ ہی دیر میں یہ لشکر اس دریا کو عبور کر کے آگے بڑھتا ہے۔ بقول میؔر:

کچھ اک ناویں لے کچھ شجر کاٹ کر
شتابی سے دریا کے تئیں پاٹ کر

اترنے لگا لشکر بے کراں
کراں تا کراں تھی یہ محشر عیاں

سلامت ہوا پار سب اژدہام
رہے دنگ خضر علیہ السلام

غرض اس طرح دوسرے کنارے پہنچ کر اُس طرف کے بھی بہت سے جانور شکار کر لئے جاتے ہیں چونکہ میر خود اس شکار کی مہم میں نواب کے ہمراہ ہیں اس لئے انھوں نے تمام روداد مفصل بیان کی ہے اور وہ اپنے لئے نواب کی ہمرہی کو خوش نصیبی سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے لئے اسے یادگار خیال کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس مثنوی میں ایک غزل بھی کہتے ہیں:

غزل میؔر کوئی کہا چاہیے
تک اس بھی زمیں پر رہا چاہیے

بعد ازاں اسی شکارنامے کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ دوسرے دن کے شکار کا احوال بیان کرتے ہیں۔

باز قدم رنجہ فرمودن آصف الدولہ بہادر روزے دیگر برائے شکار

دوسرے دن کے شکار میں بھی وہی جوش و خروش اور ہنگامہ آرائی نظر آتی ہے۔ سارے جنگل کے جانور چرند، پرند، درند اور دیگر تمام جانور بھی خوف و دہشت سے نیم جاں ہو جاتے ہیں۔ کچھ شکار کر لئے جاتے ہیں، کچھ ڈر اور خوف سے مر جاتے ہیں اور کچھ راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے بیان میں یقیناً بہت کچھ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے لیکن میؔر کو چونکہ نواب

آصف الدولہ کے لشکر کا دبدبہ اور طاقت کا مظاہرہ مقصود تھا۔ میر کہتے ہیں: ۔

گیا شور تا آسمان بریں
ہوئی گرد افواج گردوں قریں

زمیں ہوگئی جائے خوف و خطر
فلک کے لگے دیکھنے شیر نر

غرض نواب آصف الدولہ اپنے لشکر کے ساتھ گویا تمام جنگل کو تہس نہس کر ڈالتے ہیں۔ بہادری اور بے خوفی سے شکار کرتے ہیں۔ خشکی اور جانوروں کا بھی شکار کیا جاتا ہے۔ شکارنامے کی اسی روانی میں میر صاحب تسلسل بیان کے لئے مزید ایک غزل کہتے ہیں:

کوئی میر صاحب غزل یاں کہو
پر ایسی کہ ویسی کسی سے ہو کہو

اسی شکار کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے تمام جنگل چھان مارتے ہیں۔ ندی، دریا عبور کرتے ہیں، خونخوار جانور تک گھبرا کے بھاگتے ہیں یا مار دیئے جاتے ہیں۔ غرض تمام جنگل چھان مارتے ہیں۔ پہاڑ، جنگل، ٹیلے، خاردار جھاڑیاں، سبزہ زار، ہر جگہ سیر و سیاحت اور شکار کیا جاتا ہے۔ بادو باراں میں بھی ہمت اور حوصلے سے آگے بڑھتے ہیں اور کبھی خنک سردی میں بھی شکار کیا جاتا ہے۔ غرض مختلف مقامات کی سیر کی جاتی ہے۔ مقام اور اس کی جغرافیائی ماہیت کے لحاظ سے میر نے اس کا احوال بیان کیا ہے اور اپنے شعری اظہار میں روانی پیدا کی ہے اور حسب موقع اپنے بیان میں تسلسل پیدا کرنے کے لئے غزلیں بھی کہی ہیں۔ غرض سیر و سیاحت اور شکار کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ مختلف مقامات کی سیر کی جاتی ہے۔ سارا لشکر مستعد ہے، اگر انہونی پیش آتی ہے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور کامیاب و کامران اگلی منزل کی طرف چل پڑتے ہیں۔ خشکی ہو یا تری ہر جگہ کامران و کامیاب ہوتے ہیں۔ شکارنامہ کا اختتام ملاحظہ فرمایئے:

ہوئے دامن کوہ میں کچھ مقام
سفر کی بھی مدت ہو شاید تمام

کوئی روز گھاٹی کی بھی سیر ہے
سبھوں کی ہے معلوم پھر خیر ہے

جو اس میں کسو سیر کا دیں نشان
نظر آئے یا کوئی پیل دماں

تو اور ایک دو دن کی ہوتی ہے دیر
وہ ہاتھی بندھے کہئے گا یا وہ سیر

شکار ایسا دیکھا ہے اس بار کا
کہ جھاڑا ہوا دشت و کہسار کا

کوئی دیکھے کب تک پہاڑ اور جھاڑ
گلے چھاتی پر سے کہیں یہ پہاڑ

غرض ہے وزیر جہاں ارجمند
رئیس کلاں کار عالم پسند

اورآخری اشعار میں نواب آصف الدولہ کے لئے دعا کی ہے۔

در اس کا ہے باب تجودِ سراں
رہیں حکم کش اس کے زور آوراں

سدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار
جہاں میں سخن ہے مرا یادگار

غرض اس طرح اس شکارنامے میں میرؔ نے بہت تفصیل سے تمام احوال بیان کیا ہے۔ پہاڑیاں کوہ ودشت ، ندی ودریا، گھنی جھاڑیاں ،سبزہ زار، ٹیلے سب کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ آصف الدولہ کے شکار کے شوق وذوق کو بھی دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ میرؔ نے مثنوی کی صنف میں موضوعاتی توسیع پیدا کی ہے۔ شکارنامہ ایک نیا موضوع ہے۔ مثنوی چونکہ بیانیہ شاعری کے لئے

مفید صنف سخن ہے اس لئے میرؔ نے اس کا بھرپور استفادہ کیا اور شاعری میں شکارنامے کی صنف کو مخصوص مقام عطا کیا، اسے میرؔ کا ایک اہم کارنامہ کہنا چاہئے۔

۲۔ شکارنامۂ دوم

جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، یہ شکارنامہ بھی مثنوی کی ہی صنف میں کہا گیا ہے۔ پہلے شکارنامے کی طرح اس میں بھی نواب آصف الدولہ کے شکار کے ذوق وشوق کو تفصیلی بیان کیا گیا ہے۔ ابتداء میں میرؔ کہتے ہیں:

مکرر ہے نواب کو قصد صید
بیابان پہناور اب ہونگے قید

رواں بحر لشکر ہوا موج موج
گئی چشم خورشید تک گرد فوج

غرض اس شکارنامے میں بھی شکار کی وہی دھوم دھام آصف الدولہ کے لشکر کی قوت و جبروت، مختلف مقامات کو عبور کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا حوصلہ، دریا، جنگل، پہاڑی علاقے سب پر فاتحانہ کامیابی، بڑے سے بڑے جانور کا شکار یہ سب واقعات میرؔ نے بڑی کامیابی اور خوبصورتی سے بیان کئے ہیں۔ مختلف موقعوں پر بیانیہ ربط و تسلسل کے ساتھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ دوران شکار ایک مقام کا بیان میرؔ اس طرح کرتے ہیں:

کیا ایک نالے سے ہم نے گزر
ہوئی قائم اس جا پہ حشر دگر

گرے گاڑی چھکڑے پیادے سوار
کہ مقصد تھا سب کا عبور ایک بار

گذارا جو نیلوں کا پہلا ہوا
ملا خاک میں آب چہلا ہوا

کمر تک لگنے پھنسنے دلدل کے بیچ
کہ نالے کا پانی تھا یکدست کیچ

بہر کیف اس مقام سے بھی یہ شکار لشکر بہ حسن و خوبی آگے بڑھتا ہے۔ حسب خواہش جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے۔ مرغ و ماہی اور تیتر بٹیر کے شکار سے لطف حاصل کیا جاتا ہے۔ غرض میرؔ نے اس شکار نامے میں بھی نواب اور ان کے لشکر کے اس شوق و ذوق کو بہت عمدہ طریقے سے شعری اظہار عطا کیا ہے اور پھر اس سیر و شکار میں وہ خود بھی شامل تھے۔ اس لئے ان تمام واقعات کا بیان ایک چشم دید کی حیثیت سے کیا ہے۔ اگر چہ اس میں بہت سی جگہوں پر مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے لیکن میرؔ بہر حال شاعری کر رہے ہیں اور اپنے مربی و سرپرست کے اس ذوق شکار کو بیان کر رہے ہیں تو پھر میرؔ جیسے قادر الکلام شاعر کے لئے ان واقعات کا بیان یوں بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میرؔ کی طبع رواں یہاں پر اور بھی تخیل آفرینیاں دکھاتی ہے۔ اس شکار نامے کے آخر میں میرؔ عظیم ادبی تخلیقات کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُن شاعروں کا نام دنیا میں باقی ہے اور ان شعری تخلیقات میں جن نامی گرامی ہستیوں کا ذکر ہے وہ بھی گویا یادگارِ جہاں ہیں اور اسی طرح وہ اپنے لئے بھی یہ بات باعث افتخار سمجھتے ہیں کہ انہوں نے آصف الدولہ کے لئے ایسے عمدہ شکار نامے کہے ہیں۔ شکار نامے کے آخر میں میرؔ کہتے ہیں:

کسی سے ہوئی شاہ نامے کی فکر
کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر

گیا شہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم
دل شاعراں رشک سے ہے دو نیم

کنھوں نے کہی عشق کی داستاں
ہوا کوئی کھانے سے ہم داستاں

پئے آصف الدولہ میں نے بھی میرؔ
کہے صید نامے بہت بے نظیر

مگر نام نامی یہ مشہور ہو
گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو

زہے آصف الدولہ داد گر
سخن ور نواز اور عاشق ہنر

غرض یہ شکار نامہ بھی ایک کامیاب اور دلچسپ شعری تخلیق ہے۔ جس سے میرؔ کی قادرالکلامی ظاہر ہوتی ہے اور صنف مثنوی میں بھی میرؔ ایک فنکار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرتے ہیں۔

۳۔ مثنوی ساقی نامہ

''ساقی نامہ'' بھی اردو کی ایک اہم صنف سخن ہے۔ اس میں ساقی سے خطاب کیا جاتا ہے۔ ساقی ایک علامتی کردار کی حیثیت سے بھی پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کردار ہمدرد، مشفق اور غمخوار بھی ہوتا ہے۔

میرؔ کی یہ مثنوی ''ساقی نامہ'' بھی ایک اعلیٰ درجے کی شعری تخلیق ہے۔ اس کی ابتداء میں میرؔ نے حمدیہ اشعار بیان کئے ہیں جن میں خدا کی عظمت و کبریائی بیان کی گئی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں:

ہے قابل حمد وہ سرانداز
جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز

اس کو مئے حسن نے چھکایا
ہستی کا نشہ اسی سے پایا

پی اُن نے شراب خوش پرستی
طاری ہوئی اس پہ زور مستی

وہ مست شراب ناب ہے فرد
خورشید ہے اس کا جام پرداد

ہے گردش چشم اس سے افسوں
پھر جائے ہے جس کے ساتھ گردوں

ظلمت ہے دوئی کی تجھ سے احول
آخر ہے وہی وہی ہے اول

اس طرح ذاتِ باری کی افضلیت حاکمیت اور برگزیدگی کے بیان کے بعد شاعر نے موسم بہار کی طرف گریز کیا ہے اور موسم بہار کی نمو پذیری اور شادابی کا خوشگوار بیان کیا ہے۔ ہر طرف سبزہ زار اور چمن زار کا سماں ہے۔ موسم بہار اپنے شباب پر ہے، ایسے خوشگوار موسم میں شغل مے نوشی اور بھی پر بہار اور پر لطف معلوم ہوتا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں:

ساقی جو کروں میں بے ادائی
معذور رکھ اب بہار آئی

گل بادِ صبا کے تا کمر ہے
دامان بلند ابرِ تر ہے

غنچہ کی گلابیاں بھری ہیں
تکلیف کی منتظر دھری ہیں

ظالم مئے ناب دے ہوا ہے
اک جرعہ شراب دے ہوا ہے

غرض اس طرح موسم بہار کی شادابی، گلزار کی مہک اور سبزہ زار کی شادابی سے گویا دل باغ باغ ہو رہا ہے۔ اس فصل گل میں طبع شاعر سرمست ہو رہی ہے۔ اس بادہ مستی میں ہر پیر و جواں گویا بے خود ہو رہا ہے اور ہر حلقہ و خانقاہ سے اٹھ کر بے خود و مست ہو رہے ہیں، اسی بے خودی میں گویا خود کو فنا کر کے خدا کو پا رہے ہیں۔ بقول میرؔ:

از خود شدن اک مقام رہے گا
وہ مرتبہ یاں مدام رہے گا

گو پُر ہے یہ دور پر کہاں تک
اک لغزشِ پا ہے یاں سے واں تک

بیخود ہو کے یہ حجاب اُٹھے
دل یاں سے کہیں شتاب اُٹھے

پہونچیں ہیں فنا کو بے خودی سے
پاتے ہیں خدا کو بے خودی سے

اسی کیفیت سے شاعر بھی مست و بے خود ہو رہا ہے اور خدا کے حضور سراپا نیاز ہے۔ میرؔ کی اس مثنوی میں متصوفانہ اسرار واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ عشق خداوندی میں سرشار ہیں اور اسی سے لو لگائے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں:

لا اس کو جو آستین جھاڑوں
پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں

بے ہوش شراب ناب رہیے
یوں تا بہ کجا کباب رہیے

ہے مستی بے خودی ضروری
کھل جائے مقام بے شعوری

دل غم سے بھرا ہے زور میرا
تا عرش گیا ہے شور میرا

غرض مثنوی ساقی نامے میں میرؔ نے ذات باری سے اپنے تعلق خاطر کو استوار کیا ہے۔ شاعر کا دل اسی کی یاد میں مضطرب اور فریاد کناں ہے۔ غرض میر کی یہ مثنوی ساقی نامہ عشق خداوندی سے سرشار نظر آتی ہے۔ اپنی فنی تنظیم کے لحاظ سے بھی یہ مثنوی ایک شاہکار شعری تخلیق کہی جاسکتی ہے۔

مثنویات جذبات عشق

اس عنوان کے تحت میرؔ نے کل چھ مثنویاں لکھی ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے۔ (۱) مثنوی شعلۂ شوق (۲) مثنوی دریائے عشق (۳) مثنوی عشقیہ (۴) مثنوی معاملات عشق (۵) مثنوی جوش عشق (۶) مثنوی اعجازِ عشق

میرؔ کی تمام عشقیہ مثنویاں اُن کے تصورِ عشق و محبت کی ترجمان ہیں۔ غزلیہ شاعری میں میرؔ جس تصورِ عشق و محبت کا اظہار کرتے ہیں اُن کی عشقیہ مثنویوں میں بھی وہی تصورات وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ میرؔ کی یہ تمام مثنویاں اپنا المیہ اختتام رکھتی ہیں جیسا کہ میرؔ غزل میں کہتے ہیں:

میرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اردو میں عشقیہ مثنویوں کی روایت دکنی ادب میں مستحکم ہو چکی تھی۔ ان میں موضوعاتی لحاظ سے بہت سی مثنویاں عوامی روایت کے عشقیہ قصوں پر مبنی ہیں۔ شمالی ہند میں جب مثنوی نگاری کا آغاز ہوتا ہے تو وہاں بھی یہ عوامی روایت بہت سی مثنویوں میں موضوعاتی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ میرؔ کی ان مثنویوں میں عشق ایک غالب رجحان اور زندگی کی بنیادی قدر کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ گویا اس عالم آب و گل میں جو بھی مظاہرات رونما ہوتے ہیں وہ سب عشق کی ہی کارپردازیاں ہوتی ہیں۔۔ یہ مرکزی خیال میرؔ کی تمام عشقیہ مثنویوں میں جاری و ساری ہے۔ ان مثنویوں کے بنیادی کردار بھی مثالیت پسندی کے نمونے ہیں۔ اُن کا عشق بھی اپنی انتہا پسندی کا مظہر ہے۔ عام طور پر پہلی ہی نظر میں عشق کا تیر اپنا کام کر جاتا ہے اور عاشق و معشوق کے لئے زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ ہر چند کہ وصل کی کوشش کی جاتی ہے لیکن آخرش ناکامی و نامرادی مقدر بن جاتی ہے اور پھر کبھی عاشق و معشوق موت سے ہم کنار ہو کر ہم آغوش ہوتے ہیں۔ یہ انجام کچھ تو معاشرتی قیود اور پابندی کے سبب بھی سامنے آتا ہے، مخصوص مذہبی اور اخلاقی تصورات کے سبب بھی عاشق و معشوق وصل سے شادکام نہیں ہوتے۔ میرؔ کی عشقیہ مثنویوں سے متعلق نثار احمد فاروقی کا بیان درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: [1]

''میرؔ نے جتنی عشقیہ داستانیں لکھی ہیں، وہ المیہ انجام ہی رکھتی ہیں، اس میں فوق الفطری عنصر بھی ضرور ہوتا ہے، وہ بظاہر ٹریجڈی پر ختم ہوتی ہیں مگر یہ فوق الفطرت عنصر اسے کم سے کم تصوراتی حد تک طربیہ بنا دیتا ہے یعنی سماج نے اگر اپنی بندشوں کی وجہ سے عاشق کو محبوب سے زندگی میں نہیں ملنے دیا تو فطرت اس سے زیادہ پائیدار وصل کا سامان کر دیتی ہے یعنی دونوں مر جاتے ہیں اور مرنے کے بعد ایک دوسرے سے ایسے بغلگیر ہوتے ہیں کہ چھڑائے نہیں چھوٹتے۔''

ان مثنویوں میں کردار نگاری بھی کچھ زیادہ جاندار اور فعال نہیں ہے۔ عام طور پر دو ہی مرکزی کردار اور کچھ ضمنی کردار قصے میں شامل ہوتے ہیں لیکن اُن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ کردار بھی تقدیر پرست اور بے عمل ہوتے ہیں، ہر قسم کے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہیں، اُن پر عشق کا غلبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ تقریباً ہوش وحواس اور شعور سے بے گانہ ہو جاتے ہیں اور وہ جان عزیز، جان آفریں کے سپرد کرتے ہیں۔ لہٰذا شعلہ شوق، اور ''دریائے عشق'' کے عاشق و معشوق غرقِ دریا ہوتے ہیں۔

کہیں کہیں میر کی مثنویوں کی فضا مافوق الفطری اور تصوراتی بھی ہو جاتی ہے۔ مثنوی ''شعلۂ شوق'' میں یہ فضا سازی کی گئی ہے۔

میر کی عشقیہ مثنویوں میں ہر جگہ ایک ہی اخلاقی معیار اور سماجی صورت حال نہیں پائی جاتی۔ اسی لحاظ سے تصورِ عشق میں بھی تلون کیفیتی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس میں دنیاداری اور زمانہ سازی بھی ہے۔ چونکہ میر کے عہد میں غزل کی روایت میں امرد پرستی کا رجحان بھی عام تھا، اس لئے میر کی مثنوی میں بھی یہ رجحان دیکھا جاسکتا ہے۔ اُن کی مثنوی شعلہ شوق کا کردار پرسرام خود اور امرد پرستی کا شکار ہے۔ مثنوی جوش عشق اور معاملات عشق کے کردار ومنکوحہ عورتوں سے معاشقہ کرتے ہیں۔ اگر یہ مثنویاں میر کے سوانحی واقعات ہیں تو میر کی عشقیہ مثنویوں سے متعلق مولانا حالی کا درج بالا بیان بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ حالی لکھتے ہیں:[۲]

> ''اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے۔ انھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایت کے سیدھے سادے طور پر بیان کردیئے ہیں۔ نہ ان میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا سماں بیان کیا گیا ہے نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہے۔ مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز بے حیائی کی باتوں سے مبرا ہیں''۔

غرض ان مثنویوں کے بارے میں ایسا کوئی دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ اس کے لیے میر پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ میر ایک عاشق مزاج انسان تھے۔ عشق ہی ان کی زندگی کی اساس

تھا۔ جس کا اظہار ان کی غزلیہ شاعری سے ہوتا ہے۔ عشق ہی ان کی زندگی کی بنیادی قدر ہے ان مثنویوں کا مطالعہ اسی زاویہ نگاہ سے کرنا چاہئیے۔ یہاں پر میر کا مشہور زمانہ شعر کیوں نہ نقل کریں ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

غرض اب میر کی عشقیہ مثنویوں کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ مثنوی شعلۂ شوق

یہ مثنوی شعلۂ عشق کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس کے مختلف ماخذات ہیں۔ کبھی سماج میں کچھ حقائق بھی عوامی روایت کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔ اس مثنوی کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تصنیف ''اردو مثنوی شمالی ہند میں، میں اس مثنوی کے ماخذات سے تحقیقی بحث کی ہے۔ بعض محققین کہتے ہیں کہ یہ قصہ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ محمد حسن اور ایک ہندو دوشیزہ شیام سندر کے معاشقے کی کہانی ہے۔ جو پٹنہ شہر میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ محمد حسن شام سمندر کے حصول کے لیے اپنا نام تبدیل کر کے پرسرام...نام رکھتا ہے۔

مثنوی کی ابتداء میں میر نے محبت کی اہمیت اور انسانوں پر اس کی بالادستی واضح کی ہے۔ محبت کے ذریعے ہی انسان عظیم کارنامے انجام دیتا ہے۔ محبت ہی اس کی زندگی کا مقصود اور مدعا ہوتا ہے۔ ہر شئے پر محبت کے ہی اسرار طاری ہوتے ہیں۔ اور شب و روز کا سارا کرشمہ محبت کے ہی دم سے ہے۔ اور دنیا میں سارے کام اس سے انجام پاتے ہیں۔ بقول میر ؎

محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو
محبت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو

محبت سے پروانہ آتش بجاں
محبت سے بلبل ہے گرم فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہے گداز
اسی کے لیے گل ہے سرگرم ناز

محبت ہی ہے تحت سے تابہ فوق
زمین آسماں سب ہی لبریز شوق

اس کے بعد ہیر لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد وامق وعذرا اور نل ودمن جیسے عشقیہ قصوں کی مثالیں دیتے ہیں۔ آغاز قصہ میں میر پرسرام... کا تعارف کرواتے ہیں کہ یہ پٹنہ کا باشندہ تھا۔ اس کی خوبصورتی اور حسن وجمال کا بیان میر نے تفصیل سے کیا ہے۔ ایک طرح سے اس کے حسن مکمل کی سراپا نگاری کی ہے۔ اس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مرد کی نہیں بلکہ کسی دوشیزہ کے حسن وجمال کی تصویر کشی کی جارہی ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا ہے ایک عالم اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ بقول میر۔

جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ
گلستاں پہ کام اس کی خوبی سے تنگ

جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ
چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ

کھلے بال چلتا تھا وہ سرو ناز
قدم بوس کو آتی عمر دراز

جدھر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو
قیامت ادھر سے نمودار ہو

غرض جسے دیکھئے پرسرام کے حسن وجمال کو دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ ایک ہجوم اس کے پیچھے دیوانہ تھا۔ ایسے ہی بے شمار لوگوں میں سے ایک پرسرام پر عاشق وشیدا تھا۔ اور وہ کامل طور پر پرسرام سے وابستہ اور پیوستہ تھا۔ اس مثنوی میں یہی وہ موڑ ہے جس سے واضح طور پر امرد پرستی ظاہر ہوتی ہے۔ جو اٹھارویں صدی کی شاعری میں ایک رجحان کے طور پر پیدا ہو چکی تھی۔ یہی وہ موڑ ہے جس سے اس مثنوی میں ہم جنسیت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ اور پرسرام کے کردار سے قاری متنفر ہو جاتا ہے۔ میر نے دونوں کی محبت کا بیان اس طرح کیا ہے۔

انھوں میں سے اک عاشق زار تھا
اس آفت کو اس سے سروکار تھا

محبت میں تھا جذب کامل اسے
مراد دل اپنی تھی حاصل اسے

شب وروز ہم بستر... کام دل
ہمیشہ ہم آغوش آرام دل

دم اس کے میں یہاں تک تو تاثیر تھی
کہ صحبت اس عاشق سے درگیر تھی

بہم ربط چسپاں بہم اختلاط
نہ کم ہوتی گرمی نہ کم اختلاط

پھر کہانی میں اچانک یہ موڑ آتا ہے کہ پرسرام کی شادی ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی منکوحہ کے ساتھ مصروف ہو جاتا ہے اور اپنے سابقہ عاشق سے کچھ عرصے تک جدا رہو جاتا ہے۔

بقول میر۔

کہ ناگہ وہ دلبر ہوا کدخدا
رہا اپنے عاشق سے چندے جدا

زن و شو سے اخلاص باہم ہوا
اس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا

لیکن پھر پرسرام کو اپنے سابقہ عاشق کی یاد آتی ہے تو وہ اس سے ملاقات کے لئے چلا جاتا ہے۔ سابقہ عاشق ناراض ہو کر اس سے گلے شکوے کرتا ہے کہ ایسا کون عاشق ملا ہے۔ جو مجھ سے یہ دوری اور جدائی اختیار کی ہے پھر پرسرام جواب دیتا ہے کہ گزشتہ دنوں میری کدخدائی ہوئی ہے اس لیے یہ جدائی کے دن گزرے اور پھر میری منکوحہ بھی مجھے بے حد دل و جان سے چاہتی ہے

۔اسے میری جدائی گوارا نہیں بقول میر۔

کہا ان نے تھی کد خدائی مری
نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری

رکھ اب مجھ کو معذور ناچار ہوں
محبت کا میں نو گرفتار ہوں

نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام
طرف اس کے ہے دل کو میل تمام

اسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے
دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے

اسے مجھ سے ہے نسبت عاشقی
وہ رہتی ہے بے طاقت عاشقی

غرض پرسرام اس کو اپنی اس مجبوری سے واقف کرتا ہے لیکن اس کا عاشق بدستور خفا رہتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ان عورتوں میں ہرگز وفا نہیں ہوتی اور یہ کر مکر زناں ہے تو اس کے فریب میں مبتلا نہ ہو۔ دنیا میں ان کا مکروفریب مشہور ہے۔

بہ ظاہر میں ہر چند ہوں رشک ماہ
ولیکن ہیں باطن میں مار سیاہ

خدا مکر سے ان کے دے ہے خبر
نہیں ان سے کوئی فریبندہ تر

جہاں میں فریب ان کا مشہور ہے
زبانوں پہ مکر ان کا مذکور ہے

اس طرح وہ پرسرام سے کہتا ہے کہ اس عورت کا امتحان لینے کے لیے اس کے پاس یہ جھوٹی

خبر پہچانے کہ پرسرام دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوگیا۔لہٰذا ایسا ہی کیا جاتا ہے۔یہ جھوٹی خبر پرسرام کی بیوی تک پہنچائی جاتی ہے۔پرسرام کی موت کی یہ جھوٹی خبر سنتے ہی اس کی منکوحہ شدت غم سے فوت ہو جاتی ہے۔

گری ہو کہ بے جان وہ درد مند
ہوا شور نوحے کا گھر سے بلند

ہوئی غم میں اس جملہ تن ناز کے
گئی جان ہمرہ سخن ساز کے

اس جھوٹی خبر سے اپنی بیوی کی موت کی خبر سن کر پرسرام حیران رہ جاتا ہے اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔

گیا ہوش سن کر پرسرام کا
دوانہ ہوا عشق کے کام کا

اٹھا بے خود و بے خرد بے حواس
گرا آ کے اس پیکر مردہ پاس

لگا کہنے اے مایۂ ناز زندگی
مجھے منہ سے تیرے ہے شرمندگی

کیا جلد رخت سفر تو نے بار
نہ میرا کیا آہ ٹک انتظار

نہ میری سنی کچھ نہ اپنی کہی
میرے تیرے دونوں کے جی میں رہی

زمیں پر سے آخر اٹھایا اسے
لب آب جا کر جلایا اسے

غرض اپنی بیوی کی موت کے صدمے سے پرسرام آوارہ اور دیوانہ ہو جاتا ہے اسے اپنے تن بدن کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ ایک دن سرِ شام وہ دریا کے کنارے گیا اور پھر وہاں سے لوٹا نہیں۔ دریا کے کنارے ایک دام دار رہتا تھا۔ پرسرام اسی کے قریب ٹھہرا رہا۔ دام دار کی عورت نے اس سے کہا کہ تنگدستی کے سبب ہم نان و نمک کو بھی ترس رہے ہیں اب تو رات کو دریا میں دام لے کر نہیں جاتا۔ اسی لیے ہماری معیشت بدتر ہو گئی ہے۔ دام دار اپنی بیوی کو جواب دیتا ہے کہ یہ سوچ کر میں بھی حیران اور پریشان ہوں۔ لیکن میں دام کو اٹھاتا ہوں تو آسمان سے ایک تیز شعلہ دریا کی سمت گردش کرتا ہے اور اس میں ایک آواز آتی ہے کہ اے پرسرام تو کہاں ہے۔ میں نے تجھے عدم میں بھی نہیں پایا اور میرے دل کی یہ آتش کیسے بجھے گی!

کہ اک شعلۂ تند پر بہر پیچ تاب
فلک سے اترتا ہے نزدیک آب

کوئی دم تو رہتا ہے سرگرم گشت
کبھی سوئے دریا کبھی سوئے دشت

ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں
کہے ہے پرسرام تو ہے کہاں

غرض اس صیاد سے پرسرام نے اس شعلہ کا حال سنا تو وہ اور بھی بے قرار ہوا اور اس کا احوال وہ اپنے اس عاشق سے بھی بیان کرتا ہے جس نے بغرض امتحان پرسرام کی بیوی تک اس کی موت کی جھوٹی خبر پہنچائی تھی۔ وہ عاشق اس حادثہ کو سن کر بہت زیادہ رنجیدہ ہوتا ہے اور پرسرام کی دوستی اور ہمدمی کا دم بھرتا ہے۔

ندامت سے ہوں تنگ شاہد ہیں سب
گرفتار ہوں میں بحال عجب

نہ خجلت سے رو ہے جو کچھ میں کہوں
نہ قدرت اجل پر کہ مر بھی رہوں

نہ تقدیر کا میں نے سمجھا فریب
نہ جانا کہ اتنی ہے وہ ناشکیب

ہوا اک سخن میں مرے یہ غضب
خرابی کا تیری ہوا میں سبب

الغرض دونوں یہ طئے کرتے ہیں کہ لب دریا جا کر اس پر اسرار شعلہ کا نظاہرہ کریں، لہذا دونوں رازداری کے ساتھ لب دریا پہنچتے ہیں وہ ناؤ پر سوار ہو کر اس صیاد کو بھی ساتھ لیتے ہیں جو اس واقعے کا عینی شاہد تھا' کچھ ہی دیر میں وہ شعلہ آسمان سے دریا کی سمت لپک آیا اور اس میں آواز آئی کہ کہ پرسرام تو کہاں ہے اور تو محبت کا انجام دیکھ۔

کوئی دم میں دریا پہ آیا فرود
ہوا نیزہ بالا سبھوں کا نمود

لب آب وہ شعلہ جاں گداز
تڑپ کر بہت بازباں دراز

پکارا کہاں ہے پرسرام تو
محبت کا ٹک دیکھ انجام تو

کہ میں جملہ تن آتش تیز ہوں
دل گرم سے شعلہ انگیز ہوں

بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے
لب آب اتروں ہوں غم میں ترے

پرسرام یہ آواز سن کر بے حد مضطرب ہوتا ہے اور سفینے سے اتر کر اس شعلہ سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

یہ بیتاب سن کر ہوا بے قرار
سفینے سے اترا بصد اضطرار

ہوا ہمدم اس آتش انگیز سے
کہا اس بلائے دل آویز سے

کہ میں ہوں پرسرام خانہ خراب
مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب

مرے بھی جگر میں یہی سوز ہے
یہی مجھ کو جلنا شب و روز ہے

محبت تری برق خرمن ہوئی
تیری دوستی جی کی دشمن ہوئی

غرض پرسرام اس شعلہ میں جاملتا ہے۔ اور اہل کشتی یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ پرسرام موجود نہیں ہے۔ ہر چند اس کو تلاش کرتے ہیں لیکن کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر صیاد یہ کہتا ہے کہ پرسرام اس شعلہ کی جانب چلا گیا تھا۔ اور مزید تلاش کے بعد بھی پرسرام کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وہ اس غیبی شعلہ میں جاملتا ہے۔ پرسرام کا سابقہ عاشق اس المناک واقعے سے کافی رنجیدہ ہوتا ہے۔

غرض میر کی یہ مثنوی ایک المیہ ہے۔ میر نے اس میں مافوق الفطری عنصر کو شامل کرکے تحیر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہم جنسیت اور امرد پرستی کے عناصر مثنوی کی فضا کو متعفن اور غیر اخلاقی بناتے ہیں۔ مثنوی کو المیہ بنانے والا بھی پرسرام کا مرد عاشق ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ اس مثنوی سے تعلق رقمطراز ہیں۔

> ''حالی جن اخلاقی قدروں کے مبلغ تھے ان کے پیش نظر ان مثنویوں کے نتیجوں کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ بلکہ شعلہ عشق کا عاشق پرسرام بہ رضا ورغبت کسی کا امرد ہے۔ واقعے کی یہ نوعیت پرسرام کی شخصیت کو متعفن بنا دیتی ہے اور وہ ہیرو کی جگہ ایک نامطبوعہ انسان بن جاتا ہے۔''

اس طرح مثنوی شعلہ شوق اپنے المیہ انجام کو پہنچتی ہے میر کی زبان و بیان اور اسلوب یقیناً دلچسپ اور متاثر کن ہے۔

۲۔ مثنوی دریائے عشق:

میر کی مثنوی دریائے عشق بھی ایک عشقیہ المیہ ہے۔ اس مثنوی میں از اول تا آخر والہانہ عشق کی سرشاری نظر آتی ہے، اور کیوں نہ ہو عشق میر کی ظاہری اور باطنی زندگی کا سب سے بڑا محرک اور اساسی عنصر ہے۔ ان کی زندگی عشق سے ہی عبارت تھی۔ ان کے والد گرامی نے بھی انھیں نصیحت کی تھی کہ بیٹا عشق کرو یہ کائنات کا نظام عشق سے ہی جاری و ساری ہے۔ اس مثنوی کی ابتداء بھی عشق کی تعریف و توصیف سے ہوتی ہے اور زندگی کے تمام مظاہرات پر عشق کی ہی حکمرانی ہے زندگی اور موت کا دارومدار گویا عشق کے سب ہی ہے۔ میر کہتے ہیں ۔

عشق ہے تازہ کارتازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

دل میں جاکر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کہ بہا
کہیں سر میں جنون ہو کہ رہا

اسی طرح سے عشق کی نیرنگیاں بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں ۔

کون محروم وصل یاں سے گیا
کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

کام میں اپنے عشق پکا ہے
ہاں یہ نیرنگ ساز پکا ہے

جس کو ہو اس کی التفات نصیب
ہے وہ مہمان چند روزہ غریب
ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے
کہ وہ ناچارجی سے جاتا ہے

عشق کی اس تعریف وتوصیف کے بعد میر آغاز قصہُ جانگداز، کے عنوان سے مثنوی کے قصے کا آغاز کرتے ہیں۔ایک جگہ ایک جوان رعنا رہتا تھااور وہ سراپا عشق وسرمستی میں سرشار رہتا تھا حسین معشوق کے بغیر گویا اس کی زندگی بے معنی تھی وہ سراپا عشق کا پیکر تھا۔ بقول میر۔

ایک جا اک جوان رعنا تھا
لالہ رخسار و سروبالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم
دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورت خوش سے
انس رکھتا تھا وضع دلکش سے
تھا طرحدار آپ بھی لیکن
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

غرض اس طرح وہ عشق کی سرمستی میں سرشار تھا۔ایک دن اسی اضطراب کی کیفیت میں سیر باغ کو چلا جاتا ہے۔لیکن سیر چمن وگلزار سے بھی اسے کوئی راحت اور اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا روتا ہوا واپس لوٹتا ہے۔لوٹتے وقت ایک کوچے سے اس کا گذر ہوتا ہے۔ ناگاہ وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک غرفے...سے ایک ماہ پارہ اس کی طرف دیکھ کر محونظارہ ہے۔بس پھر کیا تھا' عشق کا تیر کاری لگا۔اور وہ ہوش وخبر سے بے گانہ ہوا'

بقول میر۔

ایک غرفے سے ایک ماہ پارہ
تھی طرف اس کے گرم نظارہ

پڑگئی اس پہ اک نظر اس کی
پھر نہ آئی اسے خبر اس کی

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی
وہ نظر ہی وداع طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بے قراری نے کج ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

منھ جو اس کا طرف سے اس کے پھرا
مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا

غرض اس ماہ پارہ کے آتش حسن سے یہ خاک بسر پھرنے لگا اضطراب اور بے قراری کی حالت میں کوچہ و دیار کی خاک چھاننے لگا۔ آخرش دوست آشنا یہ جان گئے کہ یہ کسی کے تیر نگاہ کا شکار ہے۔ اس طرح عوام میں اس کے چرچے ہونے لگے۔ اور پھر اس معشوقہ کے اقارب بھی اس معاشقے سے واقف ہو گئے۔ وہ کافی متفکر ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس عاشق کے دشمن جانی ہو جاتے ہیں۔

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے
درپئے دشمنی جان ہوئے

مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں
دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں

بہر حال جان سے مارنے کا ارادہ ترک کر کے اسے مخبوط الحواس مشہور کر کے سر عام رسوا کرتے ہیں اور لوگ بھی اسے دیوانہ و مجنوں سمجھ کر اس پر سنگ باری کرتے ہیں۔ لیکن وہ تو بس اپنی معشوق کا دیوانہ تھا' ہر وقت اس کے ہی خیال و یاد میں رہتا اور کبھی نسیم سحر سے کہتا ہے کہ میری پریشانی اور رسوائی کی خبر میری معشوقہ تک پہنچائے۔ بقول میر۔

چشم تر سے لہو بہا کرتا
صبح کی باد سے کہا کرتا

کائے نسیم سحر اس سے کہہ
مت تغافل کر اور غافل رہ

ان بلاؤں میں کوئی کیونکر جیے
جان پر آبنی ہے تیرے لیے

جان دوں تیرے واسطے سو تو
آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو

غرض اسی طرح آہ و زاری کرتے ہوئے فریاد کناں ہوتا ہے کہ کس طرح ہم کلامی و ہم آغوشی کی سبیل نکل آئے اور ہجر کے یہ سخت ایام ختم ہوں۔ وہ بہت ہی اضطراب اور بے قراری کے عالم میں نسیم سحر سے یہ بھی عرض کرتا ہے کہ اب یہ بات ہر خاص و عام میں پھیل چکی ہے اور سارا زمانہ اس سے واقف ہو چکا ہے۔

کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ
اک قیامت بپا ہے یاں سرراہ

کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز
اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز

بہر حال بے حد اضطراب و بے قراری کے عالم میں یہ اسی طرح نالہ وزاری کرتا ہے اور اس

معشوقہ کے کوچے میں ہی گردش کرتا رہتا ہے۔ اس دوشیزہ کے اہل خانہ کافی فکر مند ہوتے ہیں اور یہ طے کرتے ہیں کہ لڑکی کو کچھ عرصے کے لیے یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے۔ تا کہ یہ مصیبت رفع ہو جائے۔ لہذا اسے دریا کے پار ایک محافے میں بٹھا کر ایک آشنا کے گھر رخصت کیا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک مکار دایہ کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ جب اس عاشق زار کو اس کی خبر ہوتی ہے تو یہ بھی اس کے ہم رہ ہو جاتا ہے۔

گھر سے باہر محافہ جو نکلا
اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
طپش دل سے ہو کہ یہ آگاہ
ہولیا ساتھ اس کے بھر کر آہ

سفر میں وہ اسی طرح رنجیدہ خاطر اور پریشاں حال رہا آخر کار ضبط کی تاب ختم ہوئی اور اس نے اپنی معشوقہ پری تمثال سے ہمدردی اور الفت و محبت کی درخواست کی۔ اپنے حال تباہ سے آگہ کیا اب تک جو رنج وغم اٹھائے ہیں ان کا ذکر کیا۔ اس سے درخواست کرتا ہے کہ اب تو دست ستم کو اٹھا اور مجھ عشق کے مارے پھر مہر و الفت کی نگاہ کر۔

ناز وخوبی نے دل دیا نہ تجھے
رحم سے آشنا کیا نہ تجھے
اب تغافل نہ کر تلطف کر
حال پر میرے تک تاسف کر

غرض وہ مکار اور پرفریب دایہ اس کی اس فریاد کو سنتی ہے اور اسے اطمینان دلاتی ہے کہ رنج و مصیبت کا زمانہ اب ختم ہونے کو ہے اور اب تمہارے دل کی فریاد بر آئے گی۔ اور یہ کہ تیری معشوقہ بھی تیرے عشق میں سرشار ہے اور وہ بھی اب تیری دمساز ہے اور وہ دایہ اس حرماں نصیب عاشق کو اپنے ساتھ لیتی ہے۔ اور محافے میں اپنے ساتھ بٹھا لیتی ہے۔ بیچ دریا میں پہنچنے پر اس مکار دایہ نے اس معشوقہ کی ایک پاپوش دریا کی سطح پر پھینک دی اور اس جگر فگار عاشق سے کہا کہ تیری معشوق کی ایک پاپوش دریا میں ڈوب چکی ہے

افسوس اب وہ نازک بدن اپنے ننگے پیر خاک پر کس طرح رکھے گی لہذا تو دریا میں اتر کر وہ پاپوش تلاش کر لا۔

بیچ دریا میں دایہ نے جا کر
کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر

پھینکی پانی کی سطح پر اک بار
اور بولی کہ او جگر افگار

حیف تیرے نگار کی پاپوش
موج دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرت عشق ہے تو لا اُس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اس کو

غرض وہ عاشق زار اپنی محبوب کی پاپوش لانے کے لیے دریا میں کود پڑتا ہے اور غرق آب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حادثے سے اس کی معشوقہ بہت زیادہ بے قرار ہوتی ہے اور اس دایہ سے حال زار کہتی ہے کہ اب مجھے یہاں سے لے چل اور اب تو وہ آفت کا مارا بھی حیات نہیں ہے کچھ وقت دریا پر گزار کر سیر کا لطف حاصل کریں گے غرض وہ دایہ اسے محافے میں بٹھا کر اسے اپنے گھر چلنے کے لئے کہتی ہے تا کہ وہ اپنے ماں باپ سے مل کر شاد کام ہو لہذا وہ دونوں روانہ ہوتے ہیں بیچ دریا میں پہنچ کر وہ معشوقہ بے چین ہوتی ہے اور دایہ سے دریافت کرتی ہے کہ وہ عاشق زار کس جگہ پر دریا میں گرا تھا دایہ اس جگہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

پہنچی نصف النہار دریا پر
روئی بے اختیار دریا پر

حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی
دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ
یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش
تھا طلاطم سے کس طرف ہم دوش

غرض دایہ کے نشاندہی کرنے پر وہ معشوقہ بھی دریا میں کود جاتی ہے۔اور غرق آب ہوتی ہے۔

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکر
گر پڑی قصد ترک جاں کرکر

موج ہر ایک کمند شوق تھی آہ
لپٹی اس کو برنگ مار سیاہ

دایہ ماتم کرتی ہوئی اس معشوقہ کے گھر پہنچ کر یہ حادثہ جانکاہ سناتی ہے اس کے سب اہل خاندان ماتم اور آہ و بکا کرتے ہوئے دریا پر پہنچتے ہیں، غواص اور دام دار دریا میں اسے تلاش کرتے ہیں۔آخرش جب اسے اسیر دام کرتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں عاشق و معشوق ہم دست و ہم بغل ہیں بقول میر۔

خلق یکجا ہوئی کنارے پر
حشر برپا ہوئی کنارے پر

دام داروں سے سب نے کام لیا
آخر ان کو اسیر دام کیا

نکلے باہم ولے موئے نکلے
دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

ربط چسپاں بہم ہویدا تھا
مرگئے پر بھی شوق پیدا تھا

غرض اس طرح یہ داستان محبت المیہ انجام کو پہنچتی ہے۔میر کی یہ خوبصورت عشقیہ مثنوی اپنے اس المیہ انجام کی وجہ سے متاثر کن ہے۔عاشق اور معشوق اپنی حیات میں ایک دوسرے کے ساتھ

نہیں مل پائے لیکن مر کر ہم آغوش ہوتے ہیں۔ یہ مثنوی عشقیہ جذبات و احساسات کی شدت کا اظہار کرتی ہے اور جذبات عشق میں ڈوب کر عاشق و معشوق اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ مذکورہ مثنوی بھی اسی نوعیت کی ہے۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی اس مثنوی سے متعلق لکھتے ہیں:

''میر نے مثنوی دریائے عشق میں مافوق الفطرت عناصر کا پیوند نہیں لگایا۔ انھوں نے قصے کو فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ مثنوی کا قصہ اگرچہ طبع زاد نہیں مگر اس کی پیش کش اور شعریت نے اس کو پُر تاثیر بنا دیا ہے قصہ سادہ ہونے کے باوجود پوری فضا یک رنگ ہے۔ مثنوی میں مختلف عنوانات نہیں ہیں اور نہ ہی مافوق الفطرت واقعات پیش کر کے تحیر و استعجاب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صاف اور سیدھے سادے الفاظ میں واردات عشق اور جذبات عشق کا اظہار ہے۔

غرض میر کی یہ مثنوی اپنے زمانے میں بھی بے حد مقبول ہوئی تھی زبان و بیان اور قصے کی روانی کے لحاظ سے بھی یہ مثنوی متاثر کن ہے۔

۳۔ مثنوی عشقیہ

یہ مثنوی بھی عشق کی تعریف وتوصیف اور انسانی زندگی پر اس کے حاکمانہ تصرف کو ظاہر کرتی ہے۔ ابتداء میں میر نے عشق کی طاقت اور اثر انگیزی کو واضح کیا ہے عشق کی وجہ سے بے شمار لوگوں کی زندگیاں تباہ ہوئی ہیں کئی گھر خراب ہوئے اور بے شمار لوگ ہلاک ہوئے۔ غرض عشق کا وار جس پر پڑا پھر وہ دوبارہ جانبر نہ ہو سکا۔ بقول میر

غرض عشق کا ہر طرف شور ہے
نئی روز شہروں میں اک گور ہے

بہت جان ناکام دیتے گئے
تمنائے دل ساتھ لیتے گئے

میر کہتے ہیں کہ عشق مذہب وملت اور تمام فرقہ بندیوں سے بے نیاز ہوتا ہے اس لیے بہت سے اہل اسلام عشق میں کافر ہوئے جیسا کہ اس مثنوی میں میر کہتے ہیں۔

کیا عشق میں ترک صوم و صلوٰت
گئے اہل مسجد سوئے سومنات

مسلماں ہوئے عشق میں برہمن
گئے کعبے کو چھوڑ دین کہن

اسی طرح عش کی پراسراریت اور انسانی زندگی پر اس کے تصرفات کا ذکر کرنے کے بعد میر نے ایک حکایت بیان کی ہے۔ ایک افغان پسر جو گجرات کا رہنے والا ہے۔ اپنے حسن و جمال میں لاثانی ہے۔ اس طرح سے وہ پاک سیرت اور نیک خو بھی ہے:

جیسا کہ میر اس کا تعارف کرتے ہیں۔

حکایت ہے عشق حکایات میں
کہ افغاں پسر ایک گجرات میں

جواں خوش تھا پرکار و پرہیزگار
بہت حسن کا اس کے واں اشتہار

یہ صورت یہ طاعت یہ دامان پاک
نہ دامن پر مانند گل گرد خاک

لیکن اس تمام پاک بازی اور نیک سیرتی کے باوجود عشق اپنا کام کر جاتا ہے اور وہ ایک ہندو زن کے تیر نظر کا شکار ہو جاتا ہے۔ بقول میر۔

کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی
جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی

جواں کی نظر شرگیں جا لڑی
وہ شرمائی آنکھ اس کے اوپر پڑی

میر آگے مزید کہتے ہیں۔

حیا دار تھی زن گئی اپنے گھر
وفادار تھا یہ رہا دیکھ ادھر

کیا چند شرط وفا ہی کا پاس
لگے رہنے دونوں گھروں میں اداس

کئی دن میں ہندو زن آنے لگی
لیے پانی اس راہ جانے لگی

نگاہیں ہوئیں ہم دگر آشنا
محبت کا دونوں نے پانی بھرا

غرض دونوں عشق کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور ہجر کے صدمات اٹھاتے رہتے ہیں دونوں بہت بے چین اور بے قرار ہوتے ہیں۔ اغلب تھا کہ دونوں صحرانوردی کریں مجبوراً وہ صبا کو اپنا پیغام بر بناتے ہیں اور اس کے ذریعے ایک دوسرے کا حال زار کہتے ہیں :

صبا سے رہے دو طرف کے پیام
کہ اے باد کہیو یہ بعد از سلام

خیالات ملنے کے جاتے نہیں
قرار و سکوں دل تک آتے نہیں

شب وروز رہتا ہے یاں اضطراب
کیا شوق نے کام کو کیا خراب

کوئی طور ملنے کا ایجاد کر
نہ جو رحم سے ہو تو بیدار کر

غرض یہ بے قراری اور آہ وزاری پیام وکلام باد صبا کے ذریعے پہنچائے جاتے ہیں۔ اس دوران اس زنِ ہندو کا شوہر سخت علیل ہو جاتا ہے وہ کسی طرح صحت مند نہیں ہوتا اور آخرش ہلاک ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد ہندو رسم کے مطابق اسے نذر آتش کرتے ہیں۔ چونکہ زمانہ قدیم میں ہندوؤں میں ستی کی رسم کا رواج تھا یعنی عورت اپنے شوہر کی چتا میں خود کو جلایا کرتی تھی۔ لہذا یہ ہندو زن بھی اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل جاتی ہے۔ لیکن جیسے ہی اس عاشق زار کو اس کا علم ہو جاتا ہے وہ بھی اپنی معشوقہ کے ساتھ آگ میں کود جاتا ہے۔ لیکن بہر حال اس کے احباب اس آگ سے اسے نکال لیتے ہیں لیکن ادھر اس کی معشوقہ جل کر خاک ہوتی ہے۔ چونکہ یہ عاشق زار جلن اور سوزش کی وجہ سے راہ چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس لیے ایک درخت کے نیچے اسے آرام کے لئے ٹھہراتے ہیں۔ غرض وہ دن تمام ہوتا ہے اور شام کے وقت کیا دیکھتا ہے کہ وہی اس کی معشوقہ خراماں خراماں اس کی طرف آرہی ہے۔

گیا منتظر اس کو وہ دن تمام
نظر کرکے کیا دیکھتا ہے کہ شام

خراماں چھماں آتی ہے وہ پری
وہی ناز عشوہ وہی دلبری

وہی صورت اس کی ہے جلوہ نما
وہی رنگ روگل کا غیرت فضا

اسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ
اٹھایا اسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ

گئی اس طرف لے جدھر تھی چلی
نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی

ولے مانعیت کا کس کو جگر
کہ حیران سب رہ گئے دیکھکر

ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں
گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں

غرض یہ مثنوی عشقیہ بھی افغان پسر کے عشق کا المیہ ہے۔غور طلب امر یہ ہے کہ افغان پسر ایک ہندو شادی شدہ عورت پر عاشق ہوتا ہے اور وہ عورت بھی اپنے شوہر کے علی الرغم ایک غیر مرد سے عشق کرتی ہے۔مثنوی کے آخر میں میر نے اسے مافوق الفطرت عنصر سے مملوکر کے عشق کی اثر انگیزی کو شدید کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کی معشوقہ جل کر خاک ہوجانے کے بعد اس عاشق زار کی طرف چلی آتی ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔مثنوی کا یہ پہلو پر اسراریت اور داستانوی فضا سازی کو اجاگر کرتا ہے میر نے اس مثنوی میں بھی مثالی عشق کے رویے کو پیش کیا ہے۔ایک شادی شدہ عورت کا دوسرے مرد سے عشق کرنا مروجہ اخلاقی نظام پر کاری ضرب ہے۔لیکن میر کی مثنویوں میں یہ مذموم حرکت وقوع پذیر ہوئی ہے۔اس لحاظ سے مثنوی کا یہ پہلو محل نظر ہے۔

۴۔ مثنوی معاملات عشق

میر کی یہ مثنوی بھی عشقیہ ہے' یہ مثنوی میر کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں میر نے عشقیہ تجربے کے سات معاملات کا ذکر کیا ہے۔ ابتداء میں عشق کی شان میں ایک رجز ہے۔ جس طرح دیگر عشقیہ مثنویوں میں میر نے عشق کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔ یہاں پر بھی عشق ہی سے گویا کائنات قائم ہے۔ سارے مظاہر اور انسانی زندگی پر عشق ہی کارفرما ہے۔ کائنات کی تخلیق کے پس پردہ بھی عشق ہی کارفرما ہے۔ عشق پر خدا رسول اور خلفائے کرام میں جاری وساری ہے۔ بقول میر۔

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ

عشق تھا جو رسول ہو آیا
ان نے پیغام عشق پہونچایا

عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں
ہے محمد کہیں علی ہے کہیں

غرض اس کائنات میں عشق ہی کی جلوہ افروزیاں ہیں، اسی کی نیرنگیاں ہیں۔ عشق کی ہی وجہ سے لوگ زندگی میں رسوا بھی ہوئے ہیں' مارے گئے ہیں۔ عشق ہی رلاتا ہے عشق ہی ہنساتا ہے' عشق ہی آباد بھی کرتا ہے' اور کبھی برباد بھی کرتا ہے۔ جیسا کہ میر کہتے ہیں۔

شان ارفع ہیں جن کی خوار ہیں یاں
عقل والے جنوں شعار ہیں یاں

خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے
بادشہ عشق میں فقیر ہوئے

کوئی دلتنگ ہو کنویں میں گرا
کوئی ڈوبا کوئی گیا نہ پھرا

جب پتنگا ہوا تھا اس سے داغ
تب دیا جی کو ان نے پیش چراغ

غرض عشق ہر ظاہر و باطن، سیہ و سفید، نیک و بد ادنیٰ و اعلیٰ بادشاہ فقیر اور ہر بنی نوع پر قابض و متصرف ہے۔ عشق کی یہی حکمرانی بیان کرتے ہوئے میر اپنی روداد سناتے ہیں کہ میں بھی عشق کا مارا ہوا ہوں اور مجھ پر بھی یہ سانحہ گزرا ہے کہتے ہیں۔

اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا
عاشق زار میرا نام ہوا

قصہ میرا بھی سانحہ ہے عجب
کس پہ گزرا ہے یہ ستم یہ غضب

اس کے بعد میر اپنے معاشقے کا بیان کرتے ہیں۔ معاملہ اول میں میر کہتے ہیں کہ۔

ایک صاحب سے جی لگا میرا
ان کے عشووں نے دل ٹھگا میرا

غور طلب امر یہ ہے کہ جن کے عشق میں میر گرفتار ہوئے ہیں وہ پہلے سے ایک صاحب کے تصرف میں ہے۔

وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے
پر تصرف میں ایک اور کے تھے

ممکن ہے یہ معشوقہ کسی اور کی داشتہ ہو اور وہ میر سے بھی عشق کرنے لگی ہے۔ غرض میر بھی دل و جان سے اس پر فدا ہو چکے ہیں اور وہ اس کے بے مثال حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں۔ اور وہ بھی ان کا احوال جاننے کی خواہش کرتی۔

عشق کے معاملہ دوم میں میر نے اس معشوقہ اسے اپنی مزید قربت اور ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ ملاقاتوں میں چھیڑ چھاڑ محبوب کی عشوہ طرازیاں، ناز وانداز، سراپا اور خوش مذاقی کا ذکر خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ بے تکلفانہ معاملہ بندی کا یہ منظر دیکھئے:

گاہ بیگاہ پاؤں پھیلاتے
میری آنکھوں سے تلوے ملواتے

چل کر آتے تھے جب کبھو ادھر
پاؤں رکھتے تھے میری آنکھوں پر

دیکھنے میں تو پائمالی تھی
حسن سے چال یہ نہ خالی تھی

غرض میر یہاں پر معشوقہ کے ہر ناز وانداز، عشوہ طرازیاں چشم وابرو لب ورخسار، اور دیگر اعضائے جسم کے حسن وجمال کی تعریف کرتے۔ لبوں کی حلاوت نمکینی اور شیرینی کا بیان کرتے:

ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے
قند ومصری کو کیوں نہ نام رکھے

جو حلاوت انھوں کی کہیئے اب
ہمدگر سے جدا نہ ہوویں لب

غرض اس طرح میر نے از سرتاپا تمام اعضاء کی جزئیات کا بیان حسن آفرینی کے ساتھ کیا ہے۔ اس بیان میں عریانیت بھی آئی ہے۔

معاملہ سوم میں بھی میر نے معشوقہ سے محبت اور چھیڑ خوانی کا ذکر کیا ہے۔ معشوقہ کے ساتھ اپنی ایک صحبت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دن فرش پر میرا ہاتھ تھا، اس پری تمثال نے پیر سے انگلی دابی، یہ درد سے بیتاب ہوا تو معشوق نے دست نازک سے انگلی کو دیر تک دبایا

میر کہتے ہیں۔

ایک دن فرش پر تھا میرا ہاتھ
باتیں کرتے تھے وے بھی میرے ساتھ

پاؤں سے ایک انگلی مل ڈالی
دست نازک سے دیر تک دابی

یاد آتے ہیں ایسے لطف جواب
گزرے ہے جان غم زدہ پہ غضب

غرض اس طرح سے میر اپنے عشق کے اس پر لطف تجربے کو معاملہ سوم میں یاد کرتے ہیں۔ معاملہ چہارم میں معشوق کے پان کھانے کا ذکر کیا۔ کہتے ہیں معشوق کے سرخ لب نہایت حسین لگ رہے تھے۔ بقول میر۔

ایکدن پان وے چباتے تھے
سرخ لب ان کے مجھ کو بھاتے تھے

کہہ اٹھا میں اگر اگال مجھے
منہ سے دو تو کرو نہال مجھے

بولے یونہیں ہے میں کہاں ہاں سچ
جھوٹا کھاتے ہیں میٹھے کی لالچ

ہنس کے اس وقت مجھ کو ٹال دیا
پھر اسی رنگ سے اگال دیا

معاملہ پنجم میں بھی اپنی ملاقات اور تعلقات کا بیان کیا ہے جس میں میر اپنی چاہت اور وصل کا اظہار کرتے ہیں۔

دوستی رابطہ وفا اخلاص
ساتھ میرے تھا ان کا رابطہ خاص

میں تقاضائی ملنے کا رہتا
مختلط ہونے کو سدا کہتا

میری تسکین تھی ہر زماں منظور
آپ بھی کرتے ملنے کا مذکور

لیکن میر کی پریشاں حالی کو دیکھ کر کہتے کہ اپنے حال زار کو ایک نظر دیکھ لو، دوستی کرنا آفت جاں ہے۔ اس سے سوائے رنج اور درد کے اور کچھ حاصل نہیں ہے۔

جانتے تھے کہ ہے یہ دل دادہ
سید خستہ خاک افتادہ

دیکھتے مجھ کو جو پریشاں دل
کہتے اے میر کچھ نہیں حاصل

معاملہ ششم میں معشوقہ سے اپنی جدائی اور ہجر کے درد و کرب کا رقت آمیز بیان کیا ہے ۔محبوب سے شدید وابستگی کے نتیجے میں گویا وحشت طاری ہوگئی ۔ کچھ ہوش وحواس قائم نہیں رہے ۔خانماں برباد ہوئے اپنے غیر سب طعنہ زنی کرنے لگے۔لیکن محبوب کے شوق سے کبھی غافل نہیں ہوتے ۔

نے فقط جان سے جہان سے گیا
زن و فرزند و خانماں سے گیا

کیچ پانی ہو۔ منہ ہویابرسات
روز روشن ہو یا اندھیری رات

ان تلک میرے تئیں پہنچ رہنا
بیٹھے منہ دیکھنا نہ کچھ کہنا

آشنا یار سارے بیگانے
کہ ہوئے میر جی تو دیوانے

غرض اس طرح اس معشوقہ کے عشق میں میر کی رسوائی ہوتی ہے آشنا یار سب بیگانے ہوتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں۔ پھر ایک مرتبہ معشوقہ کو ایک سفر درپیش آتا ہے۔ جس میں میر بھی اُن کے ساتھ شریک رہتے ہیں۔ اس سفر کا احوال مثنوی نسنگ نامہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

میر کی اس عشقیہ داستان کا اختتام معاملہ ہفتم میں ہوتا ہے۔ عاشق و معشوق دونوں باہم قریب آتے ہیں اور دلی مراد بر آتی ہے جس کے لئے وہ عرصے سے پریشان حال تھے۔ عاشق وصل محبوب سے شاد کام ہوتا ہے اور دونوں سرشار و بامراد ہوتے ہیں۔ بقول میر۔

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط
ہوسکا پھر نہ دو طرف سے ضبط

تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب
جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب

ایک دن ہم وے متصل بیٹھے
اپنے دل خواہ دونوں مل بیٹھے

شوق کا سب کہا قبول ہوا
یعنی مقصود دل حصول ہوا

واسطے جس کے تھا میں آوارہ
ہاتھ آئی میرے وہ مہ پارہ

گہ گہے دست دی ہم آغوشی
ہمسری ہم کناری ہم دوشی

چند روز اس طرح رہی صحبت
پیار اخلاص رابطہ الفت

لیکن یہ صحبت بھی آخرکار ختم ہو جاتی ہے اور معشوق سے پھر جدائی واقع ہوتی ہے۔ ہر چند کہ معشوقہ اس کے لیے اپنی مجبوری ظاہر کرتی ہے۔

لگی کہنے کہ مصلحت ہے یہ
کتنے روزوں جدا تو مجھ سے رہ

یوں بھی آتا ہے عشق میں درپیش
کہ نشان بلا ہوں الفت کیش

میں اٹھایا نہیں ہے تجھ سے ہاتھ
کڑھیو مت تو ہے میری جان کے ساتھ

اس جدائی کا مجھ کو بھی غم ہے
کیا کروں آبرو مقدم ہے

کچھ ایسی بات تھی کہ وہ معشوقہ میر سے جدا ہوئی اور پھر وہ اسی کے ہجر او ریاد و خیال میں پریشان حال ہوتے ہیں۔ اور اپنے حال زار کا ماتم کرتے ہیں۔ یہ وہی معشوق ہے جس کے لئے میر اپنے بیگانے سب سے منقطع ہوتے ہیں بلکہ گھر سے بے گھر ہوتے ہیں بقول میر؂

برسوں تک میں پھر ا ہوں سرگرداں
روز وشب دونوں تھے مجھے یکساں

نے فقط جان سے جہاں سے گیا
زن و فرزند و خانماں سے گیا

بہر حال میر کی مثنوی عشقیہ تجربے کا بیان ہے۔ اگرچہ اس کی کہانی میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے نہ ہی

اس میں کسی مافوق الفطرت عناصر کا عمل دخل ہے۔ میر ایسی کسی عورت سے عشق کرتے ہیں جو پہلے ہی کسی اور کے بھی "تصرف" میں ہے۔ وہ عورت بھی ان سے عشق کرتی ہے یہاں تک کہ دونوں وصل کے تجربے سے شادکام ہوتے ہیں لیکن پھر جدائی عمل میں آتی ہے میر کی دیگر عشقیہ مثنویوں میں عاشق معشوق دونوں ہلاک ہوتے ہیں اس طرح ان کا انجام المیہ ہوتا ہے۔ لیکن اس عشقیہ مثنوی میں وصل محبوب نصیب ہوتا ہے۔

۵۔ مثنوی جوش عشق

مثنوی جوش عشق بھی اگرچہ عشقیہ مثنوی ہے۔ لیکن اس میں کوئی دلچسپ یا متاثر کن کہانی نہیں ہے۔ نہ ہی مثنوی میں کوئی قصہ ہے۔ مثنوی کی ابتداء میں ہی میر اپنی آنکھ لڑنے کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اپنی حرماں نصیبی اور جذبات عشق میں اپنی پریشاں حالی کا بیان کرتے ہیں۔ بقول میر۔

کر ٹک دل کا راز نہانی
ثبت جریدہ میری زبانی

یعنی میر ایک خستہ غم تھا
سرتاپا اندوہ الم تھا

آنکھ لڑی اس کی اک جاگہ
بے خود ہوگئی جان آگاہ

صبر نے چاہی دل سے رخصت
تاب نے ڈھونڈی اکدم فرصت

غرض اسی طرح وہ اپنی بے چینی بے قراری اور حالت زار کا بیان کرتے ہیں۔ خواب وخورش ختم ہو جاتی ہے۔ کسی جگہ دل نہیں لگتا۔ اور وہ مسلسل غم کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ اور وحشت وصحرانوردی بھی کرنے لگے۔ خلقت دیوانہ تصور کرتی ہے اور میر کی حالت زار پر لوگ افسوس کرتے ہیں۔

دشت تلک گئی آبلہ پائی
دور کھینچی اس کی رسوائی

اس کے جو پامال ہوئے سب
خار بیاباں لال ہوئے سب

جن نے دیکھا اس کو ایک دم
ان نے کہا یہ بھول کے سب غم

چندے یہ ناشاد رہے گا
پرمدت تک یاد رہے گا

غرض اسی طرح سے میر اپنی آشفتہ سری اور خانماں بربادی کا بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد میر نے ''درصفت دلبرے کہ بااوعلاقہ دل بود'' کے عنوان سے اس معشوق کی تعریف وتوصیف کی ہے جس سے میر کی آنکھ لڑی تھی۔اس تعریف وتوصیف میں بھی محبوب کی خوبصورتی اور حسن وجمال کی مبالغہ آمیزی پائی جاتی ہے۔گل گلزار چمن زار ماہ دو ہفتہ غرض ہر خوبصورت منظر بھی اس محبوب کے حسن وجمال کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔اس کے سراپا اور مختلف جسمانی اعضاء کا مبالغہ آمیز بیان کیا ہے۔میر کہتے ہیں۔

گل آشفتہ اس کے رو کا
سنبل اک زنجیری مو کا

جب وہ چہرہ تابندہ ہو
ماہ دو ہفتہ شرمندہ ہو

زلف اس چہرے پر تابندہ
کاکل صبح سے خوش آئندہ

دیکھ اس گل کی نور افشانی
شمع مجلس پانی پانی

ہو ہر چند یہ بدر کامل
اس چہرے کے ہو نہ مقابل

لیکن اس تمام حسن وخوبصورتی کے باوصف معشوق انتہائی بے رحم بے وفا اور بے مہر قسم کا تھا۔ اس میں ہمدردی اور وفا شعاری اور انسان دوستی کے جذبات مطلق نہیں تھے، اور نہ ہی اسے کسی کے ساتھ کوئی ربط و اتحاد تھا۔ اس معشوق کے مزاج کی یہ کیفیت خود میر نے بیان کی ہے۔ کہتے ہیں۔

تھانبا جائے کس کے کنے وہ
غصے ہو تو پھر نہ منے وہ

کیا کوئی شوخی اس کی بتاوے
کچھ ٹھہرے تو کہنے میں آوے

کیا ہے اس کے آب و گل میں
آرزو اس کی سب کے دل میں

سب کو میل اس بت کی ادا کا
بندہ کون رہا ہے خدا کا

دیکھے نہ عاشق زار کو اپنے
پوچھے نہ وہ بیمار کو اپنے

حیرت ہے کہ اس ساری بدمزاجی اور بے رخی کے میر اس کے عشق کا دم بھرتے ہیں اور اس سے عشق جتاتے ہیں۔ اس کے بعد رخصت شدہ رفتن یار و بیتاب شدن عاشق بے قرار کے عنوان کے تحت میر نے اس معشوق سے جدائی کا درد انگیز بیان کیا ہے اور وہ اس کی جدائی کے غم میں زار و قطار رونے لگتے ہیں۔

بقول میر:

بارے سفر کا مائل ہوکر
حب وطن کو جی سے دھوکر

رخصت کو اس پاس بھی آیا
جلتے کے تئیں اور جلایا

وقت وداع قیامت گزرا
سر سے آب حسرت گذرا

اک دم بے خود ہو کے رہا وہ
اس سے آگے آپ گیا وہ

آنکھیں لگیں ناسور ہو بہنے
دیکھ اس گل کو لگا یہ کہنے

غرض اس طرح اس معشوق سے جدائی ہوتی ہے اور عاشق خستہ یعنی میرؔ آہ وزاری کرنے لگتے ہیں۔ اگر چہ جدائی کے بعد اس معشوق نے میرؔ کے ساتھ خط وکتابت بھی کی ہے لیکن اس میں بھی وہی حرماں نصیبی اور غمگینی کا بیان پایا جاتا ہے۔ غرض اس طرح اس مثنوی کا اختتام ہوتا ہے۔ بقول میرؔ:

زیر لب اس کے بات یہی ہے
شام سحر دن رات یہی ہے

کھینچیں گے کب تک یہ سختی ہم
پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم

غرض اس امید پر کہ ہم جیتے جی ملیں گے، یہ مثنوی ختم ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو اس مثنوی میں کوئی خاص عشقیہ کہانی یا قصہ نہیں ہے۔ نہ ہی عشقیہ معاملہ بندی کے کوئی مضامین نظم کئے گئے ہیں۔ اس لئے ''جوش عشق'' نام کی یہ مثنوی عشقیہ جوش اور عشقیہ کیفیات وواردات سے یکسر بے کیف ہے۔

۶۔ مثنوی اعجاز عشق

میر کی عشقیہ مثنویوں میں یہ واحد مثنوی ہے جس کا آغاز حمد،نعت اور مناجات سے ہوتا ہے۔ حمد میں میر نے ذات باری کی خلاقیت اور کبریائی بیان کی ہے اور نعت میں پیغمبر اسلام اللہ کے رسول احمد مجتبیٰ سید المرسلین کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے اور آپ کو رحمت عالم اور انبیاء کے سردار جیسے خطابات سے یاد کیا ہے۔ نعت شریف کے بعد مناجات بھی لکھی ہے جس میں اپنی دلی کیفیات کا بیان کیا ہے۔ مناجات کے بعد، در تعریف عشق خانماں آباد آزادگان بر نہاد کے عنوان سے عشق کی تعریف وتوصیف اور انسانوں پر اس کی کار پردازی کو ظاہر کیا ہے۔ عشق ہی کی وجہ سے دوستی و ناداری درد و کرب اور حرماں نصیبی ہے۔ اسی کی وجہ سے دل میں درد ہوتا ہے۔ اس سے دوستی اور الفت قائم ہے۔ غرض انسانوں کی خوشی وغم اور کامیابی و ناکامی پر عشق ہی قابض و متصرف ہے۔ پھر میر نے کسی بزرگ کی زبانی یہ حکایت بیان کی ہے کہ کسی ملک میں اتفاقاً اس کا جانا ہوا جہاں اس نے ایک خوبرو نوجوان کو سرراہ بیٹھا دیکھا جس کی فقیروں کی سی حالت تھی بقول میر:

لقب اس کا دیوانۂ عشق تھا
کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا

جوانی کے گلشن کا وہ تازہ گل
کرے جس کی خاک قدم غازہ گل

اسی کی سی مقدور تک سب کہیں
سدا اس کا منہ دیکھتے ہی رہیں

وہ اک دو دماں کا تھا روشن چراغ
جلاتے تھے سارے اسی پر دماغ

ولے اس کے دل میں اک آتش نہاں
کہ دیکھئے جلا اس سے سارا جہاں

غرض اسی طرح وہ نوجواں لوگوں کے لئے ایک تماشا بنا ہوا تھا۔ نہ وہ کسی کی کچھ سنتا تھا نہ اپنی کچھ کہتا تھا۔ آخر کار یہ درویش بزرگ اس نوجوان درویش کی دلدہی کے لئے پہنچتے ہیں وہاں جانے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوجوان آہ وزاری کرتے ہوئے اپنی عشقیہ واردات بیان کرتا جاتا تھا۔ معشوق سے دوری اور المناک ہجر کے لمحات کا بیان کرتا تھا اور یہ کہ اب زندگی محال ہوئی ہے اور رسوائی و پشیمانی بھی ایک عذاب ہے۔ بقول میرؔ:

زن و مرد کی ہوں زباں سے تنگ
ہوا ہوں میں سارے قبیلے کا ننگ

سدا خونِ دل میں طپیدہ ہوں میں
کہ آہ بلب نارسیدہ ہوں میں

تری دوری میں پہنچی ہے اے حبیب
وداعِ دم واپسیں بھی قریب

جگر تو ہو پانی بہا غم کے بیچ
یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ

وہ نوجوان اپنی حالت زار بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

تو جب سے در اوپر نظر آگئی
رہیں آفتیں میرے سر پر نئی

نہ نامہ نہ پیغام نے رسم و راہ
یونہی ہوتی جاتی ہے حالت تباہ

دل و دیدہ سب مدعی ہوگئے
تماشائی مجھ پر بہت رو گئے

غرض اس نوجوان کی حالت زار دیکھ کر اور آہ وزاری سن کر بزرگ درویش نے کہا کہ تو جس معشوقہ کے عشق میں زار و قطار رو رہا ہے میں اس تک تیرا پیغام لے جاؤں گا اور تیری تباہ حالی کا احوال اس سے عرض کروں گا۔ بزرگ درویش کی دلجوئی اور غمگساری کی باتیں سن کر اس نوجوان نے معشوقہ کے لئے پیغام بھیجا:

زبانی مری در پہ یہ جا کے کہہ
کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ

ترے واسطے خوب رسوا ہوا
مرے سر پہ ہنگامہ برپا ہوا

تسلی شکیبائی مطلق نہیں
پر اب تاب تنہائی مطلق نہیں

رہی جب تلک تن میں تاب و تواں
اٹھایا تحمل کا بارِ گراں

غرض یہ درویش بزرگ عاشق کی بے قراری اور پریشاں حالی کا پیغام لے کر معشوق کے گھر پہنچتا ہے۔ وہ معشوق، عاشق کی حرماں نصیبی، پریشانی اور اضطراب کو سن کر یہ جواب دیتی ہے کہ جس عاشق میں غم عشق کو برداشت کرنے کی تاب نہ ہو اور جو آہ وزاری کے ذریعے ہمسائے کی نیند میں خلل پیدا کرے ایسے کم سواد عاشق کو مر جانا چاہئے:

کہ ہجراں میں جو بے قراری کرے
سر راہ فریاد و زاری کرے

نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو
بھلی مرگ ایسے فر و مایہ کو

محبت کی رہ میں یہ پہلا ہے کام
کہ سر سے گزر جائے شاد کام

نہیں شرط الفت میں چینِ جبیں
اگر پیش آوے دم واپسیں

جو پھوٹا ہی پڑتا ہو جوں آبلہ
وہ ہے دم میں واماندۂ قافلہ

نہ ہو جو سکے ہجر کا پائمال
تو بہتر ہے ہونا ہی اس کا وصال

جیسے ہی معشوق کا یہ دل شگاف جواب مردِ بزرگ نے عاشق کو سنایا۔ اس پر رقت طاری ہوئی۔ معشوق کا یہ جواب سنتے ہی عاشق کو شدید صدمہ ہوتا ہے اور وہ اس کی تاب نہ لا کر ہلاک ہو جاتا ہے:

حقیقت بیاں کی سب اس جائے کی
جواں نے یہ سنتے ہی اک ہائے کی

گئی ساتھ اس ہائے کے اس کی جان
گرا خاک پر ہو کے بیدم جوان
تکے تھا مگر رہِ سفر کر گیا
کہ اک بات کی بات میں مر گیا

غرض وہ مردِ درویش نوجوان کی اس ناگہانی موت سے کافی پریشان ہوتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ اس کی خبر معشوق کو دینی چاہئے۔ لہٰذا وہ اس کے گھر جا کر در خانہ پر ایک زنِ پیر کو عاشق کے موت کی خبر سناتا ہے، جب وہ عاشق کے موت کی خبر سنا کر وہاں سے دس قدم ہی چلا تھا کہ اس گھر سے ایک شور اس کے کانوں میں پڑا۔ معلوم ہوا کہ وہ معشوق بھی عاشق کی موت کی خبر سن کر فوت ہو گئی:

یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا
کہ اک شور کانوں میں میرے پڑا
گزرنے لگی دل سے آواز آہ
لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحے کی آنے لگی
کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی

غرض اس طرح یہ مثنوی بھی ایک عشقیہ المیہ ہے لیکن اس قصے میں عاشق و معشوق کے تعلقات میں کوئی قربت نظر نہیں آتی، نہ عشق کا کوئی والہانہ ربط ظاہر ہوتا ہے۔ اگر چہ میرؔ نے معشوق کے حسن و جمال کی خوب مبالغہ آمیز تعریف کی ہے لیکن وہ خود کبھی عاشق سے ملاقات نہیں کرتی، اور نہ ہی عاشق ہی اس سے خود ملاقات کی کوشش کرتا ہے۔ صرف آہ وزاری اور نالہ وفریاد کرتا ہے۔ غرض یہ نام نہاد عاشق و معشوق دونوں موت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ اس مثنوی میں میرؔ نے کسی مافوق الفطرت کردار کو پیش نہیں کیا ہے۔ زبان و بیان محاورہ بندی اور بے ساختہ اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ مثنوی یقیناً ایک اہم شعری تخلیق ہے۔

مثنوی نسنگ نامہ:

میرؔ نے ایک رئیس کی رفاقت میں نسنگ کا سفر کیا تھا۔ اس میں اس سفر کا احوال اور وہاں پر قیام میں جو تکلیفیں ہوئیں اُن کا بیان ہے۔ نسنگ نامہ سے متعلق ڈاکٹر گیان چند جین کلب علی خاں فائق کا ایک بیان نقل کرتے ہیں۔

اس مثنوی میں ۲۱۴۔ اشعار ہیں۔ کلب علی خاں فائق نے نسنگ کی دریافت کی ہے۔ مثنوی میں دو اشعار یہ ہیں:

واں سے لاڈ نسنگ پھر وانسے
جا کے واں تنگ آگئے جاں سے

بری آفت خطر تھا سکھوں کا
کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا

فائق اپنے مضمون میں نوٹ دیتے ہیں:

''تحصیل کیتھل ضلع کرنال میں نسنگ نامی گاؤں اب بھی موجود ہے۔ متصل گاؤں لاڈر نہیں لاڈو ہے۔ وانسہ بھی اب بانسہ کہلاتا ہے۔ تحصیل کیتھل ضلع پٹیالہ سے متصل ہے۔ مولانا آزاد نے اس مثنوی کا تعلق سفر میرٹھ سے کیا ہے جو صحیح نہیں، نسنگ نامی گاؤں ضلع مظفر نگر میں بھی ہے۔ مگر میر نے نسنگ ضلع کرنال کا واقعہ لکھا ہے۔ (ص ۲۸۹)

ڈاکٹر گیان چند جین مزید لکھتے ہیں:

''میر اس سفر میں دلی سے جمنا پار کر کے شاہدرے جاتے ہیں، اس لئے بظاہر نسنگ کو میرٹھ کے نزدیک ہونا چاہئے۔ لیکن سکھوں کا ذکر اس پر دال ہے کہ یہ نسنگ متصل پٹیالہ ہی ہے۔ عجیب الجھن ہے پٹیالے کے لئے جمنا پار نہیں کی جا سکتی۔ ویسے میرٹھ کے قریب ایک گاؤں لاوڑیاں اور بھی ہے۔ فائق نے میر کے سفروں کی تفصیل اور سکھوں کے غلبے کے بیان سے اخذ کیا ہے کہ مثنوی نسنگ نامہ ۱۱۸۶ ہجری کی نشاندہی کرتی ہے۔ ۲ے

بہر حال یہ سفر برسات کے موسم میں پیش آیا تھا اور بذریعہ بیل گاڑی کیا گیا تھا۔ ابتداء میں ناؤ کے ذریعہ دریا پار کرنے کا بیان بھی خوفناک ہے۔ دریا کے پانی کی روانی موجوں کا مدو جزر، پھر دریا کے پاٹ کی وسعت اور پانی کے خوف سے گویا ہر لحظہ زندگی اور موت کے بیچ گھر جانے کا ڈر میر کو لاحق تھا۔ میر کہتے ہیں:

ناؤ میں پاؤں ہم نے بارے رکھا
خوف کو جان کے کنارے رکھا

جزر و مد سب حواس کھوتا تھا
خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا

جب کہ کشتی رواں ہوئی واں سے
جسم گویا کہ تھا نہ تھی جاں سے

موجہ اٹھنے لگا جو طوفاں زا
لجہ آیا نظر سو عماں زا

کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم
ناخدائی خدا نے کی اس دم

بہر حال کسی طرح ان کی ناؤ کنارے لگتی ہے۔ بارش اور کیچڑ سے گزرتے ہوئے وہ ایک سرا میں ٹھہرتے ہیں، وہاں پر ایک بھٹیاری تھی اس نے میرؔ اور اُن کے ساتھ کے کچھ لوگوں کو دیکھ کر کچھ کھانا پکانے کا سوال کیا تا کہ اس کی بھی کچھ روزی کا بندوبست ہو سکے لیکن میرؔ جواب دیتے ہیں کہ ہم یہاں پر ایک رئیس کے ہمراہ آئے ہیں اور وہیں سے دو وقت کا کھانا مجھے ملتا ہے، میرؔ کہتے ہیں:

کچھ پکانے کا جب سوال کیا
میں نے اظہار اپنا حال کیا

یاں جو لائے ہیں مجھ کو اپنے ساتھ
زندگانی مری ہے اُن کے ساتھ

پہنچے ہے ان کے روبرو سے طعام
صبح کا صبح مجھ کو شام کا شام

میرؔ کا یہ جواب سن کر وہ بھٹیاری ناراض ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ تم بھی بے نوا شاہ عالم کے مانند ہو جو اپنے خزانے میں کچھ نہیں رکھتا۔ میرؔ کسی طرح اس بھٹیاری کو سمجھاتے ہیں۔ یہ دن بھی تمام ہوتا

ہے پھر سحر کو کوچ کرنا تھا کچھ لوگ غازی آباد چلے جاتے ہیں، کچھ راہ طے کر کے میرؔ پھر ایک سرا میں اترتے ہیں اور صاحب اپنے نوکروں کے ہمراہ ایک حویلی میں ٹھہرتے ہیں۔ اس منزل میں بھی ایک روز تک قیام رہتا ہے۔ یہاں پر میرؔ اپنی بلی سونی کے گم ہونے کا واقعہ بھی بیان کرتے ہیں اور اس بلی کی خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں، پھر وہاں سے میرٹھ جانے کا ذکر کرتے ہیں:

غرض افسوس کی جگہ بلی
اب کہاں گو کہ چھانیے دلی

ایسی بیگم مزاج بلی کھو
بیگم آباد سے ہم گئے یارو

واں سے میرٹھ سبھوں نے کی منزل
کیچ پانی اگرچہ تھا حائل

میرؔ لکھتے ہیں کہ واں سے لاڈرا اور نسنگ کی راہ تھی۔ وہ ایک ویران گڑھی میں قیام کرتے ہیں جو اجڑی ہوئی اور شکستہ تھی۔ جس میں کھانے پینے کا سامان کچھ نہیں تھا۔ جس سے سب لوگ بہت پریشان تھے۔ میرؔ کی اس مثنوی سے اس زمانے کی معاشی بدحالی بھی واضح ہوتی ہے۔ جس گڑھی میں میرؔ ٹھہرے تھے وہ غیر آباد اور ویران تو تھی ہی اس میں طرح طرح کے جانور، مچھر اور دیگر رینگنے والے جانور بھی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ میرؔ نے یہاں کے کتوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اُن کی شرارتیں، شور وغل، بھونکنے کی مسلسل آواز سے بھی نیند حرام ہوگئی۔ یہ گھر میں آ کر کھانے پینے کی چیزیں بھی تباہ کرتے ہیں۔ غرض جس طرف دیکھئے کتے ہی نظر آتے ہیں۔

باہر اندر کہاں کہاں کتے
بام و در چھت جہاں تہاں کتے

جھڑ جھڑاوے ہے کان کو کوئی
رو دے ہے اپنی جان کو کوئی

ایک طرف ہے چپڑ چپڑ کی صدا
یعنی کتا ہے چسکی چاٹ رہا

ایک چھیچھڑے کو منہ میں لے آیا
ایک چولھے کو کھودتا پایا

ایک کے منہ میں ہانڈی ہے کالی
ایک نے چلن چاٹ ہی ڈالی

تیل کی کپی ایک لے بھاگا
ایک چکنے گھڑے سے جا لاگا

کتے یارو، کہ جان کا تھا روگ
جاں بلب ہوں نہ کسی طرح سے لوگ

آدمی کی معاش ہو کیونکر
کتوں میں بود و باش ہو کیونکر

غرض اسی طرح میرؔ نے مختلف جگہوں کا احوال تفصیل سے لکھا ہے۔لوگوں کی معاشی بدحالی، مفلسی، بے روزگاری کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔آگے مزید میرؔ کہتے ہیں:

اس سے آگے بڑھے تو دھینور تھے
اجڑے پچڑے انھوں کے کچھ گھر تھے

اور آگے گئے تو تھا بازار
اس میں بنیوں کی تھیں دکانیں چار

ایک کے پاس دال کچھ آٹا
تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا

ایک کے سانواں اور تھوڑے چنے
چھبڑوں میں خاک دھول ایک کنے

معاشی بدحالی اور غربت کی تصویر کشی ملاحظہ کیجئے:

ایک دوکان تھی پساری کی
اُن نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی

اس سے جا کر جو مانگئے ہلدی
زرد مٹی کو باندھ دے جلدی

دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے
بس تم اس بستی میں میاں جی رہے

یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں
میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں

مانگو اس سے جو مرچ یا دھنیا
دیوے لُچا وہی بنا دھنیا

اُن میں دو دانے اور سب کنکر
دے کاغذ میں ہاتھ لمبا کر

معاش بدحالی کے ساتھ ساتھ میرؔ نے لوگوں کی مذہبی زندگی کے کھوکھلے پن کو بھی نمایاں کیا ہے۔ ایک ٹوٹی مسجد ہے جس میں نہ کوئی امام ہے اور نہ کوئی خطیب ہے۔ اسی طرح لوگوں کے اخلاقی زوال کی بھی تصویر کشی کی ہے۔

پھوٹی مسجد خطیب تھا نہ اذاں
یہی خانہ خطیب کا تھا واں

نہ تھی قید صلوٰۃ و رسم صوم
اس پہ سید امام واں کی قوم

بندے سب جن کا تھا خدا نہ کوئی
اس طریقے سے آشنا نہ کوئی

غرض مثنوی کے آخر میں میر اس علاقے کے سکھوں کی زور زبردستی لوٹ مار کا بھی ذکر کیا ہے۔

پڑی آفت خطر تھا سکھوں کا
کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا

اس میں آجائے تو قیامت تھی
مال و جاں غرض سب کی رخصت تھی

نہ کوئی داد رس نہ وقت داد
مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد

مثنوی کے آخری میں کہتے ہیں۔

جس نے قدرت نمائی کی اپنی
اس بلا سے رہائی کی اپنی

بس قلم ہے صریر تیری تند
شور سے تو پڑا جہا ں میں ڈنڈ

بدزبانی کا مجھ کو کب ہے دماغ
ایسی باتوں سے میں کیا ہے فراغ

ہو چکی صاحبوں کی فرمائش
چپ رہ اب ہے زمان آزمائش

الغرض اس مثنوی میں میر نے نسنگ کا تکلیف دہ سفر، پھر قیام کی مصیبتیں' لوگوں کی بدمعاشی بدحالی سیاسی شورشیں' اور دیگر سماجی مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مثنوی خواب وخیال میر

یہ مثنوی دراصل میر کی آپ بیتی ہے۔ لیکن اس میں ان کی تمام زندگی کے واقعات نہیں ہیں۔ ابتداء میں ہی انھوں نے اپنی خانماں بربادی' لوگوں کی بے مروتی' اپنی پریشاں حالی اور تنگدستی کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پرا گندہ دل

گئی کب پریشانی روزگار
رہا میں تو ہم طالع زلف یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہونچی خبر مجھ کو آرام کی

اٹھاتے ہی سر پہ پڑا اتفاق
کہ دشمن ہوئے سارے اہل و فاق

اپنے والد کے انتقال کے بعد میر اکبر آباد سے دلی چلے آتے ہیں۔ وطن کو چھوڑنے کا غم تو انھیں تھا ہی' دلی پہنچ کر بھی انھیں کوئی چین اور آرام نصیب نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں ؎

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہوگیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح وشام

میر کے دماغی خلل کا واقعہ بھی مشہور ہے۔ جس کا انھوں نے غزل کی اشعار میں بھی ذکر کیا ہے لیکن اس مثنوی میں انھوں نے اس کی پوری کیفیت بیان کی ہے۔ انھیں چاند میں ایک معشوق کی صورت نظر آجاتی تھی۔ وہی حسین چہرہ انھیں ہر جگہ نظر آجاتا، چاند میں نظر آنے والے حسین چہرے کو ہی وہ تکتے رہتے۔ کہتے ہیں۔

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور وخواب میں

اگر چند پر تو سے مہہ کے ڈروں
ولیکن نظر اس طرف ہی کروں

ڈروں دیکھ مائل اسے اس طرف
بجدے کہ آجائیں ہونٹوں پر کف

غرض میر کی یہ حالت دیکھ کر ان کے احباب بھی متفکر ہوجاتے ہیں۔ اور وہ ان کی چارہ سازی کی کوشش کرنے لگے لیکن ان کی یہ ذہنی کیفیت ویسی ہی قائم رہی۔ کبھی لگتا کہ چاند میں نظر آنے والی حسین صورت ان سے باتیں کررہی ہے۔ کبھی عشوہ طرازیاں کررہی ہے۔ اور پھر جہاں کہیں ہاتھ بڑھا کر اسے چھونے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر وہاں پر بجز وہم کچھ بھی موجود نہیں۔

جو میں ہاتھ ڈالوں وہاں کچھ نہیں
بجز شکل وہمی عیاں کچھ نہیں

ہر اک رات چندے یہ صورت رہی
اسی شکل وہمی سے صحبت رہی

غرض احباب نے یہ حالت دیکھ کر علاج معالجے کی کوشش کی۔ لیکن دوا کا بھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ طبیبوں کو دکھایا گیا۔ تعویذ باندھے گئے۔

طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے
نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے

دوا جو لکھی سو خلاف مزاج
کھنچا اس خرابی سے کار علاج

وحشت اور دل گرفتگی کچھ زیادہ بڑھی تو پھر انھیں ایک کوٹھری میں بند کیا گیا اور ایک وقت کھانا دیا جانے لگا۔ وحشت اور خوف سے کوئی ان کے قریب بھی نہیں جاتا تھا کہ کیا جانیے کیا معاملہ پیش آئے۔ میر کہتے ہیں۔

وہ حجرہ تھا گور سے تنگ تر
در اس کا نہ کھلتا تھا دو دوپہر

جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا
تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا

میر لکھتے ہیں کہ کہیں میرے خون میں کوئی خرابی نہ پیدا ہوئی ہو اس لیے بدن سے بہت سا خون نکالا گیا۔ جس سے کافی تکلیف اور بیہوشی طاری ہوئی۔

اگر چند کہنے کو خوں کم کیا
لیا لوہو اتنا کہ بیدم کیا

بڑی دیر تک خون جاری رہا
میں بیہوش وہ رات ساری رہا

غرض اسی طرح جسم سے خون نکالا جاتا رہا۔ اور وہ مضطرب اور پریشان رہے۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ صحت یاب ہو گئے اگرچہ کسی کو ان کی زندگانی کا بھروسہ نہیں تھا۔ اور چاند میں جو صورت نظر آتی تھی وہ وہم بھی کچھ کم ہوا۔ اب وہ صورت بھی گویا بیگانگی دکھانے لگی۔

وہ صورت کا وہم اور دیوانگی
لگی کرنے در پردہ بیگانگی

پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی
نہ دو دوپہر منھ لگانے لگی

نہ دیکھے میرے اور اس پیار سے
غریبانہ سرمارے دیوار سے

اگرچہ کبھی وہ باد کے ذریعہ پیغام رسائی کرتی ہے کہ اپنی محبت کو یاد کر" بے وفائی نہ کرنا لیکن یہ سب باتیں اب گویا خواب وخیال ہو گئی ہیں کہ یہ تو اب توانا اور صحت مند ہو چکے ہیں۔

کہ ظاہر میں میر اب توانا گیا
کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا

غرض ناامیدانہ کر اک نگاہ
وہ نقش توہم گیا سوئے ماہ

نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اسے جلوہ گر اس طرح

لیکن پھر کہتے ہیں کبھی خواب میں گویا وہ شبیہ اپنا جلوہ دکھایا جایا کرتی تھی۔ غرض ایک زمانہ ایسے بھی عالم خواب میں گزر گیا لیکن آخر کو یہ کیفیت ختم ہوئی یہاں تک کہ اس معشوقہ نے خواب میں پھر اپنا جلوہ کبھی نہیں دکھایا۔

دکھایا نہ اس مہہ .. نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اس کو کبھی خواب میں

بہت بے خود و بے خبر ہو چکا
ہم آغوش طالع بہت ہو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

اس طرح میر کی یہ مثنوی گویا ان کے ابتدائی زمانے کی واردات کا بیان ہے جب وہ اکبر آباد سے دلی چلے آئے تھے اور غالباً عشق میں ناکامی کا زمانہ بھی یہی ہے۔ اس وجہ سے ان پر کچھ بے خودی اور دیوانگی کی کیفیت طاری ہوئی تھی اور چاند میں انھیں معشوق کی تصویر نظر آنے لگی تھی۔ جس کی ساری روداد انھوں نے مثنوی میں بیان کی ہے مثنوی میں بیانیہ تکنیک کی روانی اور برجستگی متاثر کرتی ہے۔

مثنوی در مذمت... دنیا

میر کی یہ مثنوی دنیا کی بے ثباتی اور فنا پزیری سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ جو گزر گیا پھر اس کا نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے۔ ہر لحہ تغیرات نمایاں ہوتے ہیں۔ آج جو موجود ہے کل باقی نہیں رہتا یہاں کی ہر چیز عارضی اور فنا پذیر ہے۔

یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
جہاں جملہ ہے ایک بزم رواں

جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود اور باش

گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار
تہہ خاک سب کا ہے دار القرار

غرض انسان ہر آن رو بہ زوال ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ عناصر میں اعتدال نہیں رہتا۔ حافظہ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ میر کہتے ہیں کہ جو شاعری کی اب وہ فراموش ہو چکی ہے۔

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے
سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کے ذوق صحبت کہاں ہے دماغ

غرض اس طرح ہر چیز کمزور اور ناتواں ہو جاتی ہے اور پھر آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔ لہذا انسان کو دنیا سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔ نہ کہ اس سے دل لگانا چاہیئے۔ دنیا ایک سرائے فانی ہے۔ اس طرح میر نے دنیا اور اس کے مظاہرات کی فنا پذیری کا بیان کر کے دنیا کی مذمت کی ہے۔

حواشی:

شمارہ	مصنف	مضمون	صفحات
۱۔	آل احمد سرور:	مسرت سے بصیرت تک،	۲۷
۲۔	نثار احمد فاروقی:	تلاش میر	۱۵۶
۳۔	الطاف حسین حالی:	مقدمہ شعر و شاعری	۲۲۱
۴۔	صفدر آہ:	میر اور میریات	۳۱۴
۵۔	ڈاکٹر خوشحا زیدی:	میر تقی میر: شخصیت اور فن	۱۲۵_۱۲۴
۶۔	گیان چند جین:	اردو مثنوی شمالی ہند میں	۲۵۰

مثنویاتِ میرؔ کا عمومی جائزہ

غزل کے بعد میر کی پسندیدہ صنف مثنوی ہے۔ غزل کے رمز و ایما ایجاز و اختصار اور اشاراتی و کنایاتی طرز اظہار میں انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے بے شمار پیرائے اختیار کئے اور بہت عمدگی کے ساتھ شاہکار تخلیقات پیش کیں۔ مثنوی غزل کے مقابلے میں ایک بالکل مختلف صنف سخن ہے۔ اس صنف میں بیانیہ شاعری کے لامحدود امکانات موجود ہیں۔ اور پھر ہیت کے لحاظ سے بھی اس صنف میں آسانیاں اور تنوع موجود ہے۔ قافیے کی کوئی تحدید نہیں ہوتی۔ ہر شعر میں ایک نیا قافیہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے بیانیہ اور تفصیلی اظہار خیال کے لئے مثنوی سے بہتر اور کوئی صنف نہیں۔ میرؔ نے صنف مثنوی کے ان خصائص سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر طویل اور مختصر کل اکتیس (۳۱) مثنویات لکھی ہیں۔ ان کی مثنویوں میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ تخلیقی اظہار میں بھی جدت اور تازگی پائی جاتی ہے۔ میرؔ کی بیشتر مثنویات ان کے قیام لکھنؤ کے زمانے کی تخلیق ہیں۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ سے وابستگی اور مصاحبت کے نتیجے میں میرؔ کو وہاں کی زندگی اور دیگر حالات کو دیکھنے اور بھجنے کا موقع ملا۔ لہٰذا انہوں نے ان سے متعلق جو مثنویاں لکھی ہیں۔ اس سے بھی ان کا اندازہ ہوتا ہے۔ آصف الدولہ کی کتخدائی کی تقریبات کی جو تفصیل انہوں نے بتائی ہے اس عہد کے سماجی اور تہذیبی مرقعوں کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنؤ کی معاشرتی زندگی میں تعیش پسندی کی جو حالت تھی وہ بھی عیاں ہوتی ہے۔ اسی طرح سے مثنوی در جشن ہولی میں ہولی سے متعلق لوگوں میں جوش و خروش کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ شہر کی رونقیں رنگ و نور کی محفلیں، میلے، ہنسی قہقہے، انواع واقسام کے کھانے اور مجلسی زندگی کے تمام لوازمات کو میرؔ نے تمام جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

میرؔ کی شخصیت اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے زندگی میں بے انتہا رنج اٹھائے۔ فاقہ کشی، پریشان حالی، در بدر کی دوڑ بھاگ، بے روزگاری دلی سے ہجرت اور سب سے پہلے اکبر آباد میں معاشقے میں ناکامی نے بھی انہیں شدید

طور پر متاثر کیا تھا۔ ابتداء میں والد کے انتقال کے بعد کوئی ہمدرد اور سرپرست موجود نہیں تھا۔ والد محترم ایک صوفی اور درویش صفت انسان تھے۔ والد کے انتقال کے بعد میرؔ اپنے والد کے رفیق سید امان اللہ کی سرپرستی میں آئے۔ میرؔ انہیں چچا کہتے تھے۔ لیکن ان کا بھی بہت جلد انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے ان سے بے رخی کا برتاؤ کیا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے دلی کا سفر کیا۔ دلی میں جب میرؔ قیام پزیر ہوئے تو یہاں بھی انہیں مستقل اطمینان اور سکون حاصل نہیں ہوا۔ دلی کئی بار لٹتی اجڑتی رہی۔ بیرونی حملوں کی وجہ سے ہمیشہ قتل و غارت گری ہوتی رہی۔ میرؔ نے دلی کے یہ سب واقعات دیکھے تھے۔ لیکن پھر بھی میرؔ نے زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کیلئے اپنے لئے مختلف مشاغل ڈھونڈ لیے۔ دراصل مختلف جانوروں سے متعلق ان کی مثنویات اسی دلچسپی کا پتہ دیتی ہے۔ کتا، بلی، خرگوش، در بیان بز اس نوع کی مثنویاں ان کے مختلف جانوروں سے بھی لگاؤ کو ظاہر کرتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے میں انہوں نے یہاں کے مرغ بازی کے مقابلوں کا بغور مشاہدہ کیا اور ایک مثنوی ''مثنوی در بیان مرغ بازاں'' لکھی۔ جو لکھنؤ کی اہم سماجی روایت کو ظاہر کرتی ہے۔ مرغ بازی نوابین لکھنو کا اہم مشغلہ تھا۔ اس کے لئے مرغوں کی باقاعدہ تربیت کی جاتی تھی۔

اسی طرح میرؔ نے ''مثنوی در ہجو خانہ خود'' میں اپنے گھر کی خستہ حالی شکستگی اور اجڑنے کا حال بڑے پر تاثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح اسے پڑھ کر کسی اجڑے ہوئے گھر کا گمان گزرتا ہے۔ اسے پڑھ کر صاحب خانہ کی مفلسی اور تنگ دستی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ میرؔ نے گویا اپنی زندگی کی حقیقت بیان کی ہے۔ مثنوی کا پرتاثر انداز متاثر کرتا ہے۔ اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں مختلف کیڑے مکوڑوں نے بھی اپنا بسیرا بنا لیا ہے۔ اسی موضوع پر مبنی میرؔ کی ایک اور مثنوی ''مثنوی در ہجو خانہ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود'' بھی ہے۔ اس میں بھی شدید بارش کے سبب گھر کی تباہی و بربادی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی بھی حقیقت حال کی تصویر پیش کرتی ہے۔ اسی طرح سے ایک مثنوی بہ عنوان ''مثنوی در مذمت برشکال کہ باراں دراں سال بسیار شدہ بود'' بھی لکھی۔ جس میں بارش کی شدت اور تباہی کا بیان کیا گیا ہے۔ ان مثنویوں کے ذریعے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ موسمی تغیرات، جغرافیائی تبدیلیاں اور اس کے ذریعے انسانی زندگی پر

ہونے والی تبدیلیوں سے بھی آگہی رکھتے تھے۔

ایک مثنوی ''ہجو عاقل نام ناکسی کہ بسگاں انسے تمام داشت'' لکھی ہے۔ یہ غالباً در پردہ سودا پر ہجو ہے۔ کیونکہ سودا کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ اس مثنوی میں بھی ایسے ہی ایک شخص کا ذکر ہے جس کو انواع واقسام کے کتے پالنے کا شوق ہے اور جس کے شب و روز کتوں کے ساتھ ہی بسر ہوتے ہیں۔ ''مثنوی مسمّٰی بہ تنبیہ الجہال'' میں کم حیثیت اور ادنیٰ درجے کے لوگوں کی مذمت کی ہے جو شعر وشاعری کرتے ہیں اور فن میں بھی گویا خود کو اساتذہ کے ساتھ شامل کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے ایک مثنوی ''مثنوی اژدر نامہ'' لکھی جس میں تمام شاعروں کو کیڑے مکوڑے اور دیگر جانداروں کے مماثل قرار دیا ہے۔ اور خود کو اژدر ثابت کیا ہے گویا خود کو تمام شعرا میں افضل اور برتر ظاہر کیا ہے۔ مثنوی در مذمت آئینہ دار میں حجاموں کے فرقے کی ہجو کہی ہے ''مثنوی در ہجو اکول'' میں ایک شخص کی بسیار خوری کی مذمت کی ہے۔ ''مثنوی دیگر در بیان کذب'' میں عمومی طور پر سماج میں دروغ گوئی کی برائی بیان کی ہے۔ شہر میں جسے بھی دیکھیں دروغ گوئی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ کبھی کسی ضرورت یا مصلحت کی خاطر لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس غلط بیانی کی وجہ سے لوگوں میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے لوگ مارے جاتے ہیں اور ہنگامہ و فساد سے سماجی معیشت بھی تباہ ہوتی ہے۔ لوگ بے روزگار ہوتے ہیں اور اخلاقی لحاظ سے بھی یہ ایک معیوب عمل ہے۔ بہر حال اس مثنوی میں میرؔ نے جھوٹ کی مذمت کی ہے۔ اور انسانی زندگی میں اسے ایک نقصان دہ عمل قرار دیا ہے۔ میرؔ اعلیٰ انسانی اقدار کو عزیز رکھتے تھے۔

اس طرح ''ستائیش ہائے گوناگوں'' کے عنوان کے تحت میرؔ نے سماجی معاشرتی مذہبی اخلاقی موضوعات پر مختلف مثنویاں لکھی ہیں۔ آصف الدولہ کی کتخدائی کے موضوع پر مبنی مثنوی شادی بیاہ کے رسم ورواج اور تہذیبی وتمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہے۔ غرض میرؔ کے ہاں مثنوی نگاری کے سلسلے میں موضوعاتی تنوع کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان مثنویوں کے مطالعے سے اٹھارویں صدی کی تہذیبی تمدنی اور سماجی زندگی کے متعدد نقوش واضح ہوتے ہیں۔ جن سے میرؔ کے گہرے سماجی مشاہدے اور شعور کا پتہ چلتا ہے۔

مثنویات میر کا ایک اہم حصہ ''مثنویات شکار نامہ کے عنوان سے ہے۔ میرؔ نے دو

شکار نامے لکھے ہیں۔ دراصل موضوعاتی اعتبار سے یہ ایک نئی صنف کی اختراع ہے۔ گو کہ یہ شکار نامہ ہیں۔ سفر کا احوال پھر جنگل میں خیمے استادہ کر کے قیام کی کیفیت اور دوران شکار میں پیش آنے والے حالات موسمی کیفیات ان سب امور کے تفصیلی بیان کیلئے مثنوی سے بہتر کوئی دوسری صنف نہیں ہو سکتی۔ لہذا انہوں نے ان دو شکار ناموں میں شکار کے تمام حالات وواقعات کا تفصیلی بیان کیا ہے اور میرؔ خود ان شکار پر آصف الدولہ کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت ذکر میر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ [1]

”بندگان عالی برائے شکار تا بہرائچ رفتند من در رکاب بودم کارنامہ

موزوں نمودم بارے دیگر باز برائے شکار سواد شدنہ تادامنکوہ شمالی تشریف

بروند بعد از سہ ماہ بدار القرار خود آمدند فقیر شکار نامہ دیگر گفتہ بحضور خواند“

شکار نامہ دوم میں بھی میرؔ نے شکار کی تفصیلات وحشی جانوروں کا جنگل میں اژدہام پر ہیبت ماحول اور دیگر تفصیلات کا تفصیلی بیان کیا ہے۔

”مثنوی ساقی نامہ“ میں بہار یہ موضوع کے متعلقات کو بہت عمدگی سے پیش کرتی ہے۔

میرؔ کی مثنویات کا ایک اہم حصہ مثنویات جذبات عشق کے عنوان سے ہے۔ جس کے تحت میرؔ نے عشقیہ موضوع پر مبنی مثنویاں لکھی ہیں۔ میرؔ نے کل چھ عشقیہ مثنویاں لکھی ہےں جن کی تفصیل عشقیہ مثنویات کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ ان کی تقریباً سب عشقیہ مثنویاں المیہ انجام پر ختم ہوتی ہیں۔ یعنی عاشق و معشوق کی محبت کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوتی بلکہ دونوں بھی موت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ میرؔ کے عشقیہ مثنویات کی کہانی میں کوئی گہرائی یا شدید وابستگی نہیں پائی جاتی اور نہ ہی جذباتی اور حسیاتی طور پر کوئی کشش پائی جاتی ہے۔ بلکہ ایک نوع کی لاتعلقی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عشقیہ مثنویاں اتنی کامیاب نہیں کہی جا سکتیں۔ لیکن میرؔ چونکہ ایک عظیم غزل گو تھے اور غزلیہ شاعری کی روایت میں عاشق کی حرماں نصیبی ہجر زدگی اس کا مقدر سمجھی جاتی رہی ہے۔ میرؔ کی غزلیہ شاعری کا عاشق بھی اسی ہجر و محرومی کا مبتلا ہے۔ اور ناکامی ہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت ان کی عشقیہ مثنویوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثنوی کا موضوع کہانی کا ارتقا اور واقعات و کردار نگاری کے کچھ غیر فطری رویوں کے باوصف زبان و بیان اور طرز ادا کے لحاظ سے

میرؔ نے اپنی مثنویوں کو دلچسپ بنایا ہے۔ میرؔ شمالی ہند میں اُردو مثنوی نگاری کے بنیاد گزاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ بعد ازاں میرؔ حسن جیسے شہرہ آفاق مثنوی نگار نے یقیناً میرؔ کی مثنویات سے استفادہ کیا۔ میرؔ کا اسلوب بیان اور طرز اظہار یقیناً انہیں شمالی ہند کے ابتدائی مثنوی گو شعرا میں ممتاز درجہ عطا کرتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو غزل جیسی صنف میں کوئی شاعر میرؔ کا مد مقابل نہیں تھا۔

''مثنوی ننگ نامہ'' میرؔ کے سفر کی روداد ہے۔ یہ سفر موسم برسات میں پیش آیا تھا۔ جس میں سفر کی صعوبتیں برسات کیچڑ سکھوں اور جاٹوں کی چیرہ دستیاں بیان کی ہیں۔ اس مثنوی سے اس زمانے کی معاشی تنگدستی اور سماجی بدحالی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

مثنوی خواب وخیال میرؔ کے ابتدائی زمانے کی یادداشتوں پر بنی ہے جس میں میرؔ کے ناکام معاشقے کی بھی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ آخری ''مثنوی، مثنوی در مذمت دنیا'' ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی ناپائداری اور بے لطفی کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ کہ دنیا کی ہر چیز فنا پزیر ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرؔ نے مثنوی کی صنف کو موضوعاتی اعتبار سے بھی تنوع عطا کیا ہے اور طرز اظہار و زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اپنے وقت کے شعری مزاج سے نہ صرف ہم آہنگ کیا بلکہ اسے ایک اہم بیانیہ صنف کا درجہ عطا کیا۔ غزل کے بعد مثنوی ہی ایک ایسی صنف ہے جسے میرؔ نے بنیادی ذریعہ اظہار کے طور پر اختیار کیا جس میں تہہ داری وسعت اور تفصیلی اظہار خیال کی آسانی ہوتی ہے۔ اس لئے میرؔ نے صنف مثنوی کی ان خصوصیات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ میرؔ کی مثنوی نگاری کے اس طرز سے یقیناً بعد کے دور کے مثنوی نگاروں نے استفادہ کیا۔ اور اُردو میں کئی شاہ کار مثنویاں پیش کیں۔ خواجہ مرزا شوق کی مثنویاں میرؔ حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں یقیناً اُردو مثنوی میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں۔ اُردو مثنوی نگاری میں میرؔ نے جو طرز اور پیرائیہ اظہار اختراع کیا اس کی اہمیت و افادیت مثنوی کی تاریخ میں مسلم ہے، اور میرؔ بلا شبہ ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے بھی اپنے وقت کے لاثانی تخلیق کار ہیں۔

حواشی:

۱) ذکر میرؔ طبع اول صفحہ ۱۴۷، بحوالہ گیان چند جین، اردو مثنوی شمالی ہند میں، صفحہ ۲۱۲

کتابیات

۱۔ کلیات میر مرتبہ	(مرتبہ) عبدالباری آسی	ناشر: عاکف بک ڈپو، دہلی
۲۔ اسلوبیات میر	گوپی چند نارنگ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۳۔ نقد میر	ڈاکٹر سید عبداللہ	جہانگیر بک ڈپو، دہلی
۴۔ تلاش میر	نثار احمد فاروقی	انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی
۵۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت ڈاکٹر محمد		عمر جمال پرنٹنگ پریس، دہلی
۶۔ میر کی شعری لسانیات	قاضی افضال حسین	نشاط پریس، ٹانڈہ، فیض آباد، یوپی
۷۔ اُردو مثنوی شمالی ہند	میں ڈاکٹر گیان	چندا انجمن ترقی اردو ہند، دہلی
۸۔ ذکر میر (ترجمہ)	مرتب: نثار احمد فاروقی	مکتبہ برہان، اُردو بازار، دہلی
۹۔ میر اور میریات	صفدر آہ	علوی بکڈپو، محمد علی روڈ، دہلی
۱۰۔ میر ترقی میر شخصیت اور فن	ڈاکٹر خوشحال زیدی	بزم خضر راہ، جامعہ نگر، دہلی

مثنویاتِ میرؔ

ستائشائے گوناگون

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی در بیان کدخدائی نواب آصف الدّولہ بہادر

ہے جہانِ کہن تماشاگاہ
آصف الدولہ کا چاہے بیاہ

آؤ ساقی کہ کدخدائی ہے
طبع نواب ادھر کوآئی ہے

بول خوش احباب وشاد بہردہر
بستہ آئیں دوراستہ ہے شہر

نئے سر سے جواں ہوا ہے جہاں
عیش وعشرت کے محو خوردو کلاں

ہر طرف شہر میں ہے آرائش
رہرواں کی نہیں ہے گنجائش

شیشہ باز فلک ہے آتش باز
کہکشاں سے ہوا ہوائی ساز

ماہ سے ماہتاب کی ہے طرح
کس سے ہو لطف روشنی کی شرح

نہیں رستوں میں روشنی کے دیے
نجم ہے چشم روشنی کے لئے

کیا ستاروں کا چھوٹنا کہیئے
آسماں کی طرف ہی تک رہیئے

شب شادی کی دھوم کی کیابات
روزِ روشن تھی روشنی سے رات

دو طرف چھوٹتے جو ہینگے انار
راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار

آؤ ساقی کہ جمع ہیں احباب
سب مہیا ہیں عیش کے اسباب

لا وہ جوں آفتاب ساغرزر
آب گل رنگ سے لباب کر

آج جھوما ہے ابر بخشش زور
کچھ نظر ہے تجھے ہوا کی اور

دستِ دستور ابرِ نیساں ہے
یعنی یک دست گوہر افشاں ہے

کرچمن زار دست و دل کی سیر
ہیں نہال آج آشنا وغیر

گل نمط دل شگفتہ سب کے کیئے
خلعتِ فاخرہ سبھوں کو دیے

لا کہاں ہے وہ لالہ رنگ شراب جس سے مست گزارہ ہوں احباب
آ و مطرب لیے رباب و چنگ کاڑھو منھ سے نوائے سیر آہنگ
ہر طرف رقص میں ہیں گلرویاں پائے کو یاں ہیں سلسلہ ہو یاں
شاد مانی سے ہو نوا پرواز دے بہار گزشتہ کو آواز
گل ولالہ سے چشم باز کرے رنگ صحبت کو دیکھ ناز کرے
چھیڑ ساز طرب نوا کے تئیں باندھ آواز سے ہوا کے تئیں
وجد میں لاؤ مے پرستوں کو یاد دے ٹک سرِدوستوں کو
آؤ ساقی کہ روشنی ہے خوب محو آرائش آج ہیں محبوب
کاغذیں باغ کیا تماشا ہے پھول کترا کہ گل تراشا ہے
بکے سی مشعلوں کا ہوں بندا نور کا ماہ نے کیا چندا
شیشہ شیشہ شراب ہے درکار صحبت عیش کو چھکا یکبار
لالہ رنگ رخ نکویاں کو مایۂ ناز خوبرویاں کو
اس پری کو نکال شیشے سے رنگ مجلس میں ڈال شیشے سے
ہوئے سرمست ہو تماشائی حکم کش ہے سپہر مینائی
چھوڑ آئیں بردباری کا سیر کرے تزک سواری کا
چل گلابی کو ہاتھ میں لے لے ایک دم جام متصل دے لے
ہے سواری کے فیل کی وہ دھوم جیسے ابر بہار آوے جھوم
آئے دولت سرا سے ہو کے سوار لعل ناب وگہر ہیں صرف نثار
اک مہابت کے ساتھ فیل نشاں آگے مانند کوہِ زر کے رواں
اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے جیسے آدیں جوان مدھ ماتے
جل زربفت کی ہے ساری شب روکش انجم فلک ہیں سب
پلٹنیں جاتی ہیں برابریوں صف ہو مژگاں دلبروں کی جوں
بال بستہ رکاب میں ہیں سرنگ جن کے دیکھے کمیت چرخ ہے دنگ

خوش سواری وخوش جلو خوش راہ
باگ اُچکی تو پھر نہ ٹھہری نگاہ

گردنوں میں پڑی حمائل گل
ہے جلو میں بصد شمائل گل

تھا بہت تیز گام اسپ خیال
رہ گیا دیکھ انہوں کی چال

تھے پری زاد چھیڑے اڑجاویں
آنکھ پھیرو تو گل سے مڑ جاویں

کسمسانے میں باؤ سے آگے
ہاں کہے جیسے وہم جالا گے

نوبتی اب طبیعتوں کو رجھاؤ
پچلی سواری کا تک اصول بجاؤ

چوب نقارے پر لگا اس ڈھب
کہ رکھیں گوش اس صدا پر سب

ایک دودم بجائے جاؤ یونہیں
دلکش آواز گائے جاؤ یونہیں

پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل
رہ گزر میں ہیں رستہ رستہ گل

وہ جو دیوے تو کیا لیا جاوے
خوشہ خوشہ گہر دیا جاوے

ساقیادے وہ مے جوباقی ہے
شادی ایسی بھی اتفاقی ہے

ہو مبارک یہ جشن خوش انجام
دور گردوں بکام عیش مدام

آمغنی غزل سرائی کر
کچھ مزے سے بھی آشنائی کر

پڑھ غز میر کی جو ہووے یاد
اُن کو تو اس میں کہتے ہیں اُستاد

غزل

موسم ابر ہو سبو بھی ہو
گل گلشن ہو اور تو بھی ہو

کجتک آئینے کا یہ حُسن قبول
منھ ترا اس طرف کبھو بھی ہو

ہو جو تیرا سارنگ گل گاہے
رنجھیں ہم تب جب ایسی بو بھی ہو

ہے غرض عشق صرف ہی لیکن
شرط یہ ہے کہ جستجو بھی ہو

کشی گل کی خوشی نہیں آتی
ناز کرنے کو دیسارو بھی ہو

کسکو بلبل ہے دم کشی کا دماغ
ہوتو گل کی گفتگو بھی ہو

دل تمنا کدہ تو ہے پر میر
ہو تو اُس کی ہی آرزو بھی ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی در جشن ہولی وکتخدائی

آؤ ساقی شراب نوش کریں — شور سا ہے جہاں میں گوش کریں
آؤ ساقی بہار پھر آئی — ہولی میں کتنی شادیاں لائی
شادیاں بے شگوں سراسر ہیں — کوچے سو شہر کے برابر ہیں
دستِ دستور ہے جو زرافشاں — پھر جہانِ کہن ہوا ہے جواں
دونوں رستے عمارت خوش ہے — تازہ کاری شہر دلکش ہے
اور بازاری رنگ لائے ہیں — سارے رنگیں ستوں لگائے ہیں
جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے — شہر ہے یا کوئی تماشا ہے
چشم بددوُر ایسی بستی سے — یہی مقصد ہے ملک ہستی سے
لکھنؤ دلی سے بھی بہتر ہے — کہ کسودل کی لاگ ایدھر ہے
آئیں بستہ ہوا ہے سارا شہر — کاغذیں گل سے گلستاں ہے دہر
ایسے گل پھول ہیں جو صرف کار — راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار
بستہ آئیں دکانیں ہیں یکسر — جن میں سستی متاع لعل و گہر
میوۂ نورس ورسیدہ بہت — گل خوشرنگ وبوے چیدہ بہت
شب شادی کولڑکے ہوں جو سوار — لیں صغیرو کبیر بہر نثار
تخت بہر زنان رقص کناں — چنے رستوں میں بے چنیں وچناں
گل کا غذ سے شہر ہے گلزار — تو کہے آئی ہے بہار اے یار
ساقیا عیش کا ہو بزم آرا — سارے لوگوں میں جام مے کو پھرا
جس میں تہ پادے اس پری کو دے — درد شیشے کی شیشے میں رکھ نے
ہوگی مجلس جو مستِ آسائش — کون دیکھے گا لطف آرائش

آؤ ساقی قرار ہے باہم   کہ تماشا کناں پھریں خرم

زنِ رقاص پر نگاہ کریں   کسو سادے سے چل کے راہ کریں

کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ   کسو محبوب کو اٹھالیں ساتھ

کسو خوشرو کے منہ پہ منہ رکھ لیں   کنج لب کا کہیں مزا چکھ لیں

خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی   کسو نازک بدن سے ہمدوشی

کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست   جائینگے تھوڑی دور دست بدست

مچلے بن جائینگے کسو کو دیکھ   پھر منینگے کسو کے رو کو دیکھ

اب گلابی کو میں نے بھر بھر ہم   باقی ساقی پئیں گے پھر کر ہم

کہیں آرایش آکے دیکھیں گے   کاغذیں باغ جاکے دیکھیں گے

کسو مہوش سے ہووینگے گلباز   کھینچنگے ایک دو دم اس کے ناز

آؤساقی مے دو آتشہ دے   اسی مے کا بغل میں شیشہ لے

گرم ہو جو دماغ انساں کا   لطف آوے نظر چراغاں کا

جس طرح دیکھیے چراغاں ہے   شیشہ وشمع ہی نمایاں ہے

باغ سے روشنی ہوئی ہے زیاد   ہے یہ ہنگامہ تاجلال آباد

شمع و فانوس کا بہت ہی ہجوم   شمعی رنگوں نے کر رکھی ہے دھوم

لوٹیے اُن گلوں کی اب تو بہار   گوکسو کے گلے کا ہو جیے ہار

اب تو اودھم ہی مچ گیا ہر سو   داروپی کر پھریں چلیں ہم تو

تارے سے ہیں چراغ چار طرف   آسماں پر زمیں رکھے ہی شرف

غنچہ غنچہ دیوں کو دیکھیں جہاں   کسو نو گل سے رکھیں صحبت داں

کہیں نوبت کو چلکے سنیے گا   نے کے بجنے پہ سر کو دھنیے گا

نوبتی خوش سلیقے سارے ہیں   نے نوازوں نے جان مارے ہیں

آج نوبت کے بجنے پر ہے رنگ   عقل ہوتی ہی سن ٹکوری دنگ

جھانجھ کے سننے کی رہی ہے جھانجھ   صبح جوں توں کے ہم کریں ہیں سانجھ

بیچ میں ہولی آئی ہے ساقی   پھیرے سرخوش ہی تا بلے بالی

شیشہ شیشہ شراب اب پیجئے   بلکہ خم منہ لگا کے سب پیجئے

سیر کریے کنار نہر و گشت   لالۂ و گل کھلے ہیں تا سردشت

انہیں پھولوں کے انعکاس سے آب   تو کہے لالہ رنگ سب ہی شراب

سبد گل ہوئی ہے ہر کیاری   ایک ہے گل زمیں زمیں ساری

درمیاں یک شجر نہیں بدبرگ   ہے ہزارہ کہ لالۂ صدبرگ

جوش لالہ سے تااوا لنج و سنگ   شفقی ہو گیا ہوا کا رنگ

تخت کیونکر نہ ہو دماغ خاک   دشت دردشت ہی گل تریاک

پھر لبالب ہیں آب گیر رنگ   اور اڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ

پاس آتے ہیں مرغ گلشن بھول   تھے دے دلبر گلاب کے سے پھول

زعفرانی لباس تھے سب کے   رسم سے آئے صبح کو شب کے

پگڑیاں جامہ بھیگی سو سو ہیں   ان کو گلہائے ترکہیں تو ہیں

چھڑیاں پھولوں کی دلبروں کے ہاتھ   سیکڑوں پھولوں کی چھڑی سے ساتھ

قمقمے جو گلال کے مارے   مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے

خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں   گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں

جشن نوروز ہند ہولی ہے   راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

عشق ہے اے گروہ آتش زن   دونوں رستے چراغ ہیں روشن

ٹھاٹھ کیا روشنی کے باندھ دیے   شہر میں نام روشن اپنے کیے

دور دو تھے خیال سوانگ آئے   گھوڑے دامن سوار کیا لائے

روشنی دار سے ہی پار تلک   گل کا کاغذ ہے فرق خار تلک

دردولت سے لے کے تاسرآب   ہے چراغ اور شمع ہی کی تاب

پھیرسرِ پل سے تاعمارت نو   جلتے ہیں مجتمع دیے سو سو

ہاتھی رنگ گئے پڑی ہے دھوم   جیسے ابر سیاہ آئے جھوم

خیمہ استادہ کر چکے شب باز   پتلیوں نے کیا خرام ناز
یاں کی صحبت کا تھا نمونہ سب   شاہ دستور حکم و کار ادب
آئے شکلیں بنا کے صورت باز   ڈوم ڈھاڑی بنے بجاکر ساز
نقل معقول کی سو حاجی بنے   سج کے عمامے سر پہ کتنے جنے
کوئی جوگی کوئی فقیر بنا   کوئی داڑھی لگا کے پیر بنا
کوئی بنیا بنا کوئی اوباش   نقل کرنی تھی اُن سبھوں کی معاش
کوئی شاعر بنانہ جس کی نظیر   جیسے مستغرق خیال تھامیر
کچھ سپاہی بنے تھے کچھ تجار   کوئی زاہد ہوا کوئی خمار
جس کی تقلید کی سو ویسی طرح   اصل ہوتی نہیں ہے ایسی طرح
کرکے سعی وتلاش چاروں دانگ   خوب دیکھا تو ہے یہ عالم سوانگ
آؤ ساقی نہ رکھ خراب احوال   دیے جا جامِ بادہ مالا مال
چل سواری کا سیر بھی ہے بڑا   ایک عالم ہے دونوں رستہ کھڑا
جل زربفت پوش فیل نشاں   کوہ زر ساہے پیش پیش رواں
کدخدا ہوتے کوچلا دولھہ   بال و گوپال عظم سے جوں شہہ
گل کی پاکھر پڑی ہوئی یکبار   ہاتھی آیا برنگ ابر بہار
زری پوشوں کا پیش وپس انبوہ   اللہ اللہ ری ان کی شان وشکوہ
قور میں کتنے سونے کے سے پہاڑ   آگے روپے کی روشنی کے جھاڑ
موتی کرتے تھے ہرطرف سے نثار   تھا مگر فیل ابر گوہر بار
ہیں جلومیں زمینیاں حاضر   جاہ کے آسمانیاں حاضر
عمدہ سب ساتھ ہیں وزیر سمیت   شاعراں مدح خواں ہیں میر سمیت
تازی ترکی عراقی و عربی   کوتل آگے تھے خوش جلو میں سبھی
رہیں رکھ لو جہاں کہ منھ کے نرم   چھیڑے بادسموم سے ہوں گرم
آؤ ساقی پلا شراب ہمیں   روشنی کی نہیں ہے تاب ہمیں

روشنی بھی ہے کوئی ہنگامہ — سیر میں گرم ہوگیا جامہ
گرمی سے مشعلوں کے آئے تنگ — دودِ مشعل ہے جائے کاہی رنگ
دوطرف سیم بندی کردی ہے — سونے روپے سے راہ بھردی ہے
شمعیں لاکھوں کنول میں ہیں روشن — زور پھولا ہے کاغذی گلشن
واہ آتش زناں آتش دست — داروپی کرپھر و ہو کیسے مست
توپیں کیا ڈھالیں ہیں ستارونکی — کھوئی رونق فلک کے تاروں کی
تارے موقوف کچھ ساپہ نہیں — توپیں چھوٹیں مگر ہوا پہ نہیں
ماہ بھی چشم روشنی کے لئے — ہے چراغاں ستارگاں سے کئے
گنج چھوٹے ہیں یا کہ باڑ جھڑی — یا ہوائی ہے جگنیوں کی چھڑی
گل فشاں ہی پڑی جو پھلجھڑیاں — کھلتیاں ہیں دلوں کی کلھڑیاں
چھوٹتے ہیں انار و مہتابی — رنگ ہیں دلبروں کے مہتابی
باؤ سے دودیے ہوئے گرماند — دغیں مہتابیاں کہ نکلے چاند
آؤ اے مطربانِ سیر آہنگ — ساتھ اپنے لیے رباب وچنگ
ہو غزلخوان بزم عیش وطرب — پرنہ کریو خیال ترکِ ادب
منعقد مجلس شہانہ ہے — ادب آصف زمانہ ہے
آؤ ساقی مجھے قرابہ دے — دربغل شیشہ ساتھ اپنے لے
بحر بخشش کی لہریں اب آئیں — زرد گوہر کی کشتیاں لائیں
ہے بلند اس کرم کا کیا پایہ — دیتے ہیں خلعت گرانمایہ
طرہ ہائے زری وبادلہ تاس — تختہ ہائے دو شالہ تحفہ لباس
بہت اُن میں سے بہت نہ سئے — ایک دم میں سبھونکو بخش دئے
کیا بچھا ہے فراخ دستر خوان — جس پہ ہے خلق یک جہاں مہماں
تو رہ بندی ہوئی تکلف سے — کھانے نکلے نئے تصرف سے
لطف کے ساتھ نعمتوں کاوفور — زیرِ ہر جعبہ قاب ہے پر نور

عام تھا ان لطافتوں سے طعام — دیتے لیتے تھے ہر سحر ہر شام
کس کو اسباب یہ میسر ہیں — ظرف سیمین جعبۂ زر ہیں
ہیں جو مہمان بادشاہ وگدا — حرص دونوں کی سیر ہے یکجا
عمر و دولت ہواسکی حد سے زیاد — ہے اُسی سے جہاں نشاط آباد
آؤ ساقی غزل سرابھی ہو — لذّت شعر سے مزا بھی ہو

غزل

اب کی بہار کیا کیا دریا پہ رنگ لائی — اک شہر نکلے لالہ پھر اس میں ہولی آئی
کی فکر سوال تاریخ آواز غیب آئی — ہم! نے کبھی نہ دیکھی اس رنگ کدخدائی
آنکھوں کی روشنی تھی اپنی ہوئی دوچنداں — طالع نے چاندنی میں کیا روشنی دکھائی
ہو بادجسطرف کی آنکھیں اُدھر ہیں اُسکی — نرگس کا اس ہوا میں دیدہ بھی ہے ہوائی
بےگل رہے نہ یکدم بلبل کے آہ ونالے — محبوب سے کسو کو یارب نہ ہو جدائی
گل تک ہنسا نہ مجھسے بلبل نہ بولی ہرگز — کس کس کی بیدماغی بے یار میں اٹھائی
ہم بھی رہے ہوا وہ جبتک جوانِ جاہل — کی عمر رفتنی نے بارے نہ بیوفائی
اخواں زمانہ کے تو کیا جانیں دل لگی کو — لگتی ہے جس کے دل کو وہ جانتا ہے بھائی
ہے دامگاہ دنیا ہر جافریب اس میں — دیتی نہیں دکھائی اپنی مجھے رہائی
گزری جو کچھ سوگزری یاری میں دلبروں کی — میراب کسو سے تم تو کریو نہ آشنائی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی در بیان ہولی

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر — رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر
جشن نوروزی اہل ہندو سب — ہے یہی تب محو عشرت ہیںگے اب
شیشہ شیشہ رنگ صرف دوستاں — صحن دو لتخانہ رشک بوستاں
اس چمن میں باغ پر گل سرخ وزرد — نکہت گل جھاڑینگے واں آکے گرد
پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر — لالۂ و صدبرگ سب باغ نظر
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں — جیسے گلدستہ تھے جوؤں پررواں
زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس — عطرمالی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھہار — رنگ باراں تھا مگر ابر بہار
مرغ گلشن گلرخاں کو جان پھول — بیٹھتے ہیں پاس آکر پھول پھول
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال — جس کے لگتا آن کر پھر منھ ہے لال
برگ گل ملواں اڑاتے تھے عبیر — تھی ہوا میں گردتا چرخ اثیر
روشن الدولہ نے کی تھی روشنی — کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک — تھے تماشائی گداؤ شاہ تک
راہ میں تر پولیے مینار تھے — روشنی کے کوچۂ و بازار تھے
گرم کچھ ہنگامہ یہ بھی کم نہ تھا — اس روش کی دھوم کا اودھم نہ تھا
ابتو ہفت اقلیم کا عالم ہے یاں — دیکھ تو ہر جنس کا آدم ہے یاں
ٹٹیاں دریا کے باندھیں دو طرف — کیا چراغاں آسماں کی ہو طرف
تھا جہاں تک آب دریا کا بہاؤ — واں تلک تھا اس چراغاں کا دکھاؤ
ایک عالم دیکھتا تھا دور سے — رات دن تھی روشنی کے نور سے

کوچۂ و بازار وبام دور بنے
روشنی کے دونوں رستہ گھر بنے

سوانگ کیا کیا بنکے آئے درمیاں
پیکھنے کا سوانگ تھا سارا جہاں

آئے کس کس رنگ سے دامن سوار
باد کے رنگوں جنھوں کا تھا گزار

ہاتھی آئے کوہ پیکر کیا بنے
جیسے مدہ ماتے جواں ہوں انمنے

کیسی کیسی دیکھی شکلیں تازیاں
سحر کرتے تھے کہ صورت بازیاں

اُن دیوں کے عکس سے دریا کا آب
آئینہ کے سطح کی رکھتا تھا تاب

منعکس تھے جو چراغاں تہہ تلک
آب کی وسعت تھی پرنجم فلک

کیا ہوائی چھوٹنے کا ہے بیاں
ذوذنب جیسے ستارے ہوں عیاں

جاہی جوہی چھوڑنا ہے یاد بود
روشنان ذو ذوانب تھے نمود

گنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ
دوطرف جسطرح سے جھڑتی ہے باڑ

اس روش سے تھے ستارے چھوٹتے
ناگہاں جو ہودیں تارے ٹوٹتے

دیکھے جاتے تھے چراغاں آب میں
شعلے تھے لہروں کی پیچ وتاب میں

ہر دو جانب چن گئے ناری انار
گلفشانی سے انھوں کی تھی بہار

ماہتابی اک طرف سے جو دغی
چاند سانکلا ہوئے حیران سبھی

آفریں صناع لوگو آفریں
کیا لگایا باغ آکر کاغذیں

گل کترکر پھول گل ہی کردیے
رنگ بازے کاغذوں میں بھردیے

متصل توپیں ستاروں کی دغیں
لوگوں کی آنکھیں فلک سے جالگیں

دیکھیاں کیا کیا نہ شعلہ خیزیاں
تھیں ہوا میں سے ستارہ ریزیاں

نذرکو نواب کی اہل فرنگ
لیکے آتشبازی آئے رنگ رنگ

عرصہ گلریزی سے گلشن ہوگیا
چرخ اُن تاروں سے روشن ہوگیا

داغیاں توپیں ہوائی ایک بار
پھیلے تارے آسماں پر بے شمار

کیا ہوائی باد میں لہراگئی
تاری سانپوں کے سے من پھیلاگئی

کیا ہی آتش دستیاں دیکر گئے
شعلوں سے پانی کی لہریں بھرگئے

رحمت اے آتش زناں کیا لاگ ہے — تہ بساط آب دریا آگ ہے
لکھ غزل اب میر رنگیں تو کوئی — سنکے ہو محظوظ جس کو ہر کوئی

غزل

لالہ کنار دریا نکلا ہے کیا زمیں سے — اٹھتی نہیں ہیں آنکھیں دیکھو ادھر کہیں سے
بالیدگی سے پہونچے گل آدمی کے سر تک — ہووال تو رنگ ٹپکے جیب اور آستیں سے
خوش رنگ ترے ہے ہر گل رخسار سے پری کے — صد برگ واں طرف ہی خورشید کی جبیں سے
منھ پر عبیر عاشق اصرار سے ملے ہیں — کب ہاتھ کھینچتے ہیں معشوق کی نہیں سے
صندل بھری جبیں سے کیا صبح چہرہ ہووے — الجھے ہیں ہاتھ یکسو گیسوئے نازنیں سے

جب میر جان دینا بوسے کے بدلے ٹھہرا
تب خوف کیجئے کیا پیشانیوں کی چیں سے

مثنوی دیگر

تھا کپی کا بچہ اک درویش پاس — باش و بود اُس کی تھی مجھ درویش پاس
اس قلندر نے بحسب احتیاج — بیچنے اُس کو نکالا لاعلاج
میں نے اُس کو ایک جا دلوادیا — مول ٹھہرا تھا جو کچھ سو لا دیا
بوزنہ یا کوئی تحفہ دھر کا — عزت افزا بندا بن شہر کا
نام منوا اس کا اب مشہور ہے — شوخی اس کی ہر کہیں مذکور ہے
ہے ہنومانی نسب یہ باب دید — قایل وصف اس کے حضرت بوحمید
ہے جو لکھو بندری مشہور اب — اس کی جد مادری تھی بوالعجب
اُس کے پردادا نے ہی یہ حرف دی — ایک دم لابہ میں لنکا پھونک دی
ایک چنچل ہے بلائے روزگار — ہاتھ رہ جائے تو پاسر گرم کار
ہے تو بچہ سا ولیکن دور ہے — پست اُس کی جست کا لنگور ہے
کیا کوئی انداز شوخی کا کہے — ہو معلق زن تو آدم تک رہے

چپلاہٹ اسکی سب معلوم ہے
معرکوں میں چوک کے اک دھوم ہے

ہوتے ہیں قراد کب دیکھے سے سیر
چیلی اس کی رہے ہے یاد دیر

حرکتیں دلکش ہیں سب انداز خوب
پر ضروری ہے کہ ہاتھوں میں ہو چوب

ورنہ بوٹا ساجوقد ہے جھاڑ ہے
کٹکھنا نچنا ہے کپڑے پھاڑ ہے

لونڈی باندی سبکو اس سے احتراز
ڈر سے اکثر بی بیوں کے دل گداز

یہ جو چاہے چھوٹے تو تدبیر کیا
رسی ڈوری لوہے کی زنجیر کیا

ربط اسے جس سے ہے اس سے ربط ہے
مار کھانے پر بھی اس کو ضبط ہے

جب وہ چھوٹے شورو ہنگامے رہیں
ابتو چھوٹا ابتو چھوٹا سب کہیں

چھوٹتا ہے گر پڑے کوئی بجوگ
بندروں سے ناچتے پھرتے ہیں لوگ

ہوتے ہیں اس جنس میں بھی ذی خرد
آدم وحیواں میں یہ برزخ ہیں بد

طنز ہے یہ بات اگر چہ ہے کہی
جو کرے انسان تو بوزینہ بھی

لیکن اس جاگہ توصادق ہے یہ قول
سارے اس کے آدمی کے سے ہیں ڈول

ہے تماشا آئینہ کے روبرو
عکس سے اپنے اسے ہے گفتگو

دیکھنا جھک جھک کے اس کا ہو نہ ضبط
آرسی بندر کا ہے مشہور ربط

گاہ بوسہ گاہ غر غر بولنا
گاہ آنکھیں موندنا گہ کھولنا

آگے تھا اک بوزنہ شطرنج باز
چال سے اُس کی نکلتا امتیاز

کہنہ قرادوں سے ہم کو یاد ہے
یہ اسی فتان کا داماد ہے

جان دیں بندر اگر دیکھیں چنے
رہتے ہیں چانول پڑے اس کے کنے

آنکھ کب دوڑے ہے اس کی ہر طرف
ہے یہ اپنے نوع کا فخر و شرف

الغرض منوا عبارت جاں سے ہے
نام اس دلکش کا منوایاں سے ہے

خوش رہے منواتو خوش احوال میر
ورنہ آدم ہے جوانی میں بھی پیر

دہر میں یارب نہ یہ محزوں رہے
جس کا منوا ہے اُسے میموں رہے

مثنوی دیگر

ایک بلی موہنی تھا اُس کا نام
اُن نے میرے گھر کیا آکر مقام

ایک دو سے ہوگئی الفت گزیں
کم بہت جا لے لگی اُٹھ کر کہیں

ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ
دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ

آئے ہے مجھ پاس یہ اٹھ کر سویر
گربۂ زردِ فلک نکلے ہے دیر

یعنی وقتِ گرگ و پیش آئے ہی پاس
پھر مرا پہروں کیا ہے اُن نے پاس

چھیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے
فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

بختوں سے ٹوٹا ہے چھینکا بھی اگر
اُن نے اودھر کی نہیں مطلق نظر

دخل کیا ہے جھانکے یہ چھینکے کی اور
ٹکڑے کو دیکھے نہ گو بھوکی ہو زور

اس مروت پیشہ سے کیا ہے گلا
خوف سے آپھی گبھے چوہا ملا

ایک بلی کچھ گئی تھی آکے چکھ
یہ لڑی تو منھ پہ پنجہ اپنے رکھ

برسوں یاد آوے گی یہ پاکیزہ خو
آگے آئی ہی نہیں چلتے کبھو

لانگھے ہو جو گھر سے جاتے تد رہوں
چلتے چھینکا ہو کبھو تو کچھ کہوں

تھی جو ظاہر جوں کڑاہی تیرہ رنگ
پر تماشا کردنی تھے اس کے ڈھنگ

شوق میں ہمسائیاں اُس کے رہیں
جو گئی بھی ٹک تو مانگے سے کہیں

پھرنے کو تو پھرتی کیا دلی نہ تھی
پر جلے پانوں کی یہ بلی نہ تھی

رفتہ رفتہ کوٹھوں پر جانے لگی
پہروں پہروں میں یہ پھر آنے لگی

حاملہ ہو کر گئی بچے دیے
ایک دو بھی ونہ ان میں سے جیے

متصل ایسا ہوا جو اتفاق
مرگ ان بچوں کی گزری سب پہ شاق

حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا
جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہوا

نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈھ کر
نیل کے ڈوروں میں باندھے پیٹ پر

چھیچھڑوں پر بعضوں نے افسوں لکھے
بعضوں نے تعویذ لے کر خوں لکھے

گوشت کی چیلوں کو پھینکیں بوٹیاں ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں
لڑکیاں بھلائیاں کھاٹوں تلے اس طرح جوں دبکی بلی کم بلے
دیتے ٹکڑا منھ کو ہر اک کھولتے اور بولی بلیوں کی بولتے
صدقے اُترے چھیچھڑے جو ڈھیر ڈھیر گربۂ لاوہ نے کھائے ہو کے سیر
کیں مناجاتیں دل سب لاتعد گربۂ زاہد سے بھی چاہی مدد
بوہر یہ کے تئیں مانا بہت بلیوں کو بھی دیا کھانا بہت
مدح جس بلی کی کرتا تھا عبیدا تھی دعا گوئی میں وہ بے مکر و شید
خواجہ عصمت کرتے تھے طاعت جہاں ایک بلی بیٹھی تھی آکر وہاں
صبحدم ہوتی وہی گرم سجود گہ قیام اُس کے تئیں تھا گہ قعود
چاہی ہمت اس سے اُٹھ کر ہر سحر کچھ تو باطن نے کیا اُس کے اثر
پانچ بچے اُس نے اس نوبت دیے بارے سب دے قدرت سے جیے
کیوں نہ ایسی ہووے امداد سترگ بی بلائی بوہر یہ سب بزرگ
اک توجہ رکھے تھے ظاہر کی اور آرزو برلائے یہ باطن کی زور
اپنی ماں کے رات دن سینے لگے پانچوں بچے دودھ کچھ پینے لگے
دودھ کتنا جو کہ بس ہو سب کے تئیں میں بھی منگوانے لگا کچھ شب کے تئیں
دودھ پی کزگائے بکری کا چلے روز و شب لوگوں کی آنکھوں کے تلے
دیر میں میں نے جو یہ ٹک غور کی بلیاں پانچوں ہیں یہ اک طور کی
دو مہینے تک بہت تھی احتیاط کتے بلی سب سے موقوف اختلاط
کوئی کتا آگیا ایدھر اگر لوگ دوڑے شیر سے منھ پھاڑ کر
در سے نکلیں سب ہوئے بازی کے گرم زرد زرد دان کی دمیں منھ نرم نرم
لچھے ریشم کے سے چندیں رنگ خال کچھ سفید دکچھ سیہ کچھ زرد و لال
آنکلتی تھیں جدھر یہ پانچ چار وہ طرف ہو جاتی تھی باغ و بہار
ایک عالم عاشق و بیتاب تھا اُن کی خاطر بے خور و بے خواب تھا

لے گئے ایک ایک کرسب تین تو — منی، مانی، رہ گئیں بچ پاس دو
منی کی پھر ایک صاحب نے پسند — تھی بھی نازک ایسی ہی طالع بلند
مانی کچھ بھاری تھی نکلی بردبار — رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار
بوریے پر میرے اُس کی خوابگاہ — دل سے میرے خاص اس کو ایک راہ
میں نہ ہوں تو راہ دیکھے کچھ نہ کھائے — جان پاوے سن مری آواز پائے
سب سے آگے آن پہونچے درتلک — دیکھے میرے پاؤں سے لے سرتلک
آنکھ سے معلوم ہو مشتاق ہے — بلی یا اعجوبۂ آفاق ہے
بلیاں ہوتی ہیں اچھی ہر کہیں — یہ تماشا سا ہے بلی تو نہیں
گرد رو باندھے تو چہرہ حور کا — چاندنی میں ہو تو بکا نور کا
گرم شوخی ہو اگر یہ مثل برق — بجلی میں اُس میں نہ کچھ کر سکیے فرق
یا پری اس پردے میں ہے جلوہ گر — اٹھتی اودھر سے نہیں ہرگز نظر
کیسی ہی بلی ولایت کی ہو زور — خوب دیکھو تو ہے اس کے صدقے حور
ربط ہے اپنے بھی جی کو اس کے ساتھ — بیٹھے ہی تو پیٹھ پر میرا ہے ہاتھ
ایک دن جا کر کہیں ٹک سو گئی — مانی مانی سارے گھر میں ہو گئی
بلی کا ہوتا نہیں اسلوب یہ — ہے کبودی چشم یک محبوب یہ
دیکھے جسدم یک ذرا کوئی اس کو گھور — چشم شور آفتاب اس دم ہو کور
حسن کیا کیا مانی کے کریے بیاں — ہو جہاں جبتک یہ ہووے درمیاں
خوبی منی کی نہ کوئی کہہ سکے — دیکھے اس کو تو نہ اس بن رہ سکے
داغ گلزاری سے اس کے تازہ باغ — اس زمانِ تیرہ کی چشم و چراغ
کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس — کیا مصاحب بے بدل کیسے جلیس
یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز — آنکھ دوڑے ہی نہ ہو کیسی ہی چیز
اس کو گر کعبے میں یہ ہو شوخ و چست — ہے کبوتر مارنا واں کا درست
چوہا چڑیاں اُن نے کچھ کھایا نہیں — حج کو جانا اس کے تئیں آیا نہیں

محبت ہرّہ جو کہ ہے ایمان میں ہے اسی بلی کی شاید شان میں

تھا بہت منی کا جنا آرزو سو جنی دو بلیاں یہ ماہ رو

خال ہیں ان پر بھی ماں کے سے عیاں پردہ خوبی اور محبوبی کہاں

موہنی اور سوہنی ہے ان کا نام پھرتی ہیں پھندنا سی دونوں صبح وشام

نیلے دھاگے گردنوں میں ہیں پڑے لوگ آنکھوں میں ہی رہتے ہیں کھڑے

حفظ ابھی بلوں سے انکا ہے ضرور رہیو ان دونوں سے چشم شور دور

دیکھے اُن کی اور جوئنگ کر کے خشم رہیوان دونوں سے چشم شور دور

قصہ کوتاہ موہنی آگے موئی یک قیامت جان پر اس بن ہوئی

صبر بن چارہ نہ تھا آخر کیا بلی ماروں میں اسے گڑ وادیا

شاد وہ جس کے رہیں قائم مقام وائے اُس پر جس کسو کا بس نہ نام

مثنوی در تعریفِ سگ و گربہ کہ درخانہ فقیر بودند و باہم ربط داشتند

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں دو ہیں قالب اور اُن کی ایک ہے جاں

رنگ گربہ سے شیر نر ہے داغ آنکھیں اُسکی اندھیرے گھر کا چراغ

کھائے نہ جو نہ ہو وہ مادۂ سگ بھوکھا بیٹھا رہے قیامت لگ

سارے ہمسایوں پر ہے یہ معلوم موش کی نسل ہوگئی معدوم

چوہا کیا ہے جو سامنے آوے گھونسوں سے بھی یہ شیر بھڑ جاوے

اُن نے جو ماریاں ہیں گھونسیں دھونس موش دشتی ہوا ہے کونے کھونس

گھونس جب فکر ہی میں مرتی ہو موش دشتی پہ کیا گزرتی ہو

کوئی چھچھوندر جو بستی میں یاں ہے سووہ چوہوں کی مرثیہ خواں ہے

گھونس کیسی بتاؤں غیرت سونس طاق ہے جس کے آگے طاقت سونس

یا کوئی مادہ خوک آستین یا کسو کچھوے کی برادر زن

پھرتی پھرتی جو صحن میں خوشحال | پائے دیوار بیٹھی سر کو نکال

کہیں اودھر یہ شیر جاتا تھا | پھیر تا منھ پہ پیچے آتا تھا

پڑگئی اس کی اس پہ چشم کبود | نیلا پیلا ہو تاؤ کھا جوں دود

پنجہ جھنجھلا کے ان نے گزرانا | بارے کچھ گھونس نے اسے جانا

پر اسے خوف جاں نہ آیا کچھ | غالب آیا نہ اس کا سایہ کچھ

ٹھک ٹھکایا پھر ان نے جانا تو | کیونکہ تھا یہ تو شیر کا خالو

پھر تو بگڑی ہے دونوں میں آکر | چوٹ ہوتی تھی داؤ پا پا کر

غصہ خرموش کو بھی آن چڑھا | اتفاق اس جگہ تھا یک گڑھا

دونوں لڑتے ہوئے گرے اسمیں | کیچ کا گاچتے پھرے اس میں

ناخن اس شیر کا کچھ ایک گڑا | شور محشر گڑھے کے بیچ پڑا

شور کیسا محلے چونک اٹھے | سگ بازاری بھونک بھونک اٹھے

یاں تو گھر بیچ کیا ہے کیا ہے پڑی | گھونس بلی نے چھچھڑے کردی

کھڑے موچھوں کے بال انگڑاتا | شیر نکلا گڑھے سے گھبراتا

لیک جی سے تا سب بدن خالی | کیونکہ سر سے بلا بڑی ٹالی

گھونس کے وارثوں کی کیا ہے تاب | کہ قدم کو رکھیں وہ حتی الباب

کوئی چھچھوندر اب اس پہ روئی ہے | کہ تری لاش خوار ہوتی ہے

توجو تھی ساری قوم کی سردار | سو اٹھایا ہے زخم دامن دار

ہم بہت غم میں تیرے روئیں گے | بل کے بل اب خراب ہو دینگے

فخر ہے اپنی نسل کا یہ شیر | جن نے گھونسوں کے کردکھائے ڈھیر

سنا ہے موش گربہ کا قصہ | وہ جو ہے گا عبید کا حصہ

جس کو باندھا عبید زاکانی | لگتی تھی اس کی وہ سگی نانی

گربہ تو بود فاسق و فاجر | صید او یک بدے بسالانا

ایں زباں پنج پنج می گیرد | کہ شدہ مومن و مسلمانا

در تعریف مادہ سگ

ہے جو وہ مادہ سگ تماشا ہے
دوڑ پڑے کے وقت باشا ہے

کسی کے لقمے پہ نہ منھ ڈالا
سگ اصحاب کہف کی خالا

نہیں کتوں سی خواریاں کے یہ
ہے سگوں میں عزیز خاں کے یہ

دے ہرن کو بھی جلدی میں بتا
ہے گایاں سگ لوند کیا کتا

اڑتی چڑیا انہیں نے ماری ہے
استخوانِ سگِ شکاری ہے

یہ جو غصے میں آوے تو ہے غضب
اس کے مارے ہوئے ہیں ہارے سب

منھ میں دیتے ہیں اس کے جب مشعل
طرفہ دم لابہ کرتی ہے اچپل

منھ میں اپنے لیے فتیلے سے
سگ لیلےٰ کے ہے قبیلے سے

باہم اس کتے بلی کا یہ ربط
کوئی دیکھے نہ ہووے اُس سے ضبط

کبھو جاتا جو ہے یہ کوٹھے پر
لگی رہتی ہے اس کی چھت سے نظر

اور سے دشمنی جانی ہے
اسکی یہ باؤلی دوانی ہے

دونوں شوخی سے مارسہتے ہیں
سگ و گربہ کی چال رہتے ہیں

مرثیہ خروس کہ در خانہ فقیر بود

کئی برسوں سے ہمارے کنے تھا ایک خروس
خروس عرش کی اولاد سے ولے افسوس

پھرا جو اس سے یکا یک زمانہ کج باز
قضا نے اس کو کیا ایک بار مرغ انداز

دیا کرے وہ اذاں دونوں وقت صبح وشام
بجا ہے مرغ مصلی رکھیں گر اس کا نام

نہیں ہے مرغ چمن میں جہاں کے ایسا آج
برنگ کلہ تاج خروس سر پر تاج

جو بیٹھے چھانھ میں پرواز پر سے مرغ خیال
کھڑا ہو دھوپ میں تو رشک مرغ زریں بال

کبھو جو صحن میں گھر کے وہ اشرف الطیار
پھرا ہے کیس کو ڈالے تو مرغ آتش خوار

نہ بطخیں ہیں ثنا گستری میں اس کے مدام
بزرگداشت کریں مرغ سبزدار تمام

رہا ہمیشہ سے وہ مرغ مستعد جنگ — طرف نہ اس کے ہوئے پنجگی میں قاز وکلنگ

جب ان نے گانٹھ کے اک لات حلق پر ماری — شتر دلی کی شتر مرغ نے کئی باری

نہ اس کے سامنے کوئی کھڑا رہا مرغا — حواصل اس سے بگڑتا تو تھا وہ کیا مرغا

بجز کنارانہ سیمرغ کو بنا چارا — کہ فیل مرغ کو بکری کی طرح سے مارا

ہمیشہ گربہ وسگ سے تھی روک ٹوک اسے — جہاں سے لے گئی آخر یہ نوک جھوک اسے

خصومت اس کی تھی یک ملہ سگ سے شام وسحر — کبھو وہ لات اسے مارتا کبھو شہپر

قضا جو پہونچی تھی نزدیک وہ بھی جھنجھلائی — حریف ہو کے دلیرانہ سامنے آئی

یہ بھبھا تھا نہ سمجھا ادا کو کینے کی — لگائی سامنے ہوتے ہی ایک سینے کی

ہلائی ان نے بھی گردن لگی کہیں بیکل — کہ ایک دم میں گئی آہ اس کی گردن ڈھل

جھکا جو خاک کی جانب کو کیس بیجاں کا — زمیں پہ تاج گرا ہدہد سلیماں کا

ہوا کے مرغ ہوئے داغ اسکے ماتم سے — سیاہ پوش رہے طائر حرم غم سے

وہاں جو نوحۂ مرغان قدس باز ہوا — کہ مرغ قبلہ نما کا بھی دل گداز ہوا

قفس کے مرغ نے سن ترک آب ودانہ کیا — طیور نے بھی نہ پھر قصد آشیانہ کیا

ہوا زبس کہ پراگندہ یہ غم جانسوز — اداس رہنے لگے سارے مرغ دست آموز

فروس عرش ہی اس بن نہیں ہی سینہ فگار — ہزار مرغ کا اب گھر خروس پر ہے بار

زمانہ جب تئیں ہے اُس کے درد کے مارے — رہینگے خاک فشاں مرغ خانگی سارے

خموش میر تجھی کو نہیں یہ رنج وتعب
کباب آتشِ غم میں ہیں مرغ وما ہی سب

مثنوی در بیان بز

کہتے ہیں جو غم نداری بز خبر — سوہی لی میں ایک بکری ڈھونڈھکر

شعر زور طبع سے کہتا ہوں چار — دزدی بزگیری نہیں اپنا شعار

دزد ہے شایستہ خونریزی کایاں — بلکہ بابت ہے بز آوبزی کایاں

میں پڑھوں ہوں اس کے آگے شعر گہ　　اپنے ہاں گویا بز اخفش ہے یہ

بکروں کی داڑھی کے تئیں جانے ہیں سب　　تکہ ریشِ بکری کی ہے بوالعجب

رنگ سر سے پاؤں تک اس کا سیاہ　　چکنی ایسی جس پہ کم ٹھہرے نگاہ

چار پستاں اُس کے آئے وید میں　　دو جہاں ہوتے ہیں دو ہیں جید میں

ایک میں ان میں سے تھا مطلق شیر　　ایک کو کہتے ہیں اندھی خردو پیر

اسپہ کالے بکرے دو خیلا جنے　　ناز نخرے سے رہے پھر اٹھنے

چارہ بیٹھے کھاتے اک انداز سے　　دیتی پٹھہ تو ہوتے خوش اس ناز سے

دودھ منگوایا کئے بازار سے　　پھوہوں سے دینا کیا انفار سے

گھاس دانہ بارے کچھ کھانے لگے　　گرتے پڑتے پاس بھی آنے لگے

پرورش سے حق کی بارے جی گئے　　آب و دانہ دوڑ کر کھا پی گئے

اب جوانی پر جو ہیں وہ شیر مست　　کودتے ہیں ہر زماں ہر دم ہیں جست

مستی اپنی ماں پہ کرتے شاد ہیں　　عاقبت بکرے ہی کی اولاد ہیں

زور و قوت سے حریفوں کے ہیں دھینگ　　آہوئے جنگی کو دکھلاتے ہیں سینگ

نکران کی کیا جگر مینڈھا اٹھائے　　قوچ سرزن سامنے ہرگز نہ آئے

سرزنی میں شہرہ آفاق ہیں　　لوگ بز گدنسی کے سب مشتاق ہیں

رنگ کو اس جنگ کا کیا ڈھنگ ہے　　دیتے ہی میداں کا عرصہ تنگ ہے

ہوتے ہی استادہ طاری ہو غشی　　کیا بز کو ہی سے ہو میداں کشی

تیس ان کی دھاک سن کر مرگیا　　غم گوزنوں کو انھوں کا چر گیا

گو وہ ٹکر کھا جو ڈکراتا رہا　　بزدلی سے گرگ بھی جاتا رہا

مارے پانی پانی کر بکرے اصیل　　لکھنؤ سے غل ہے تا بکرے کی جھیل

پاس جانا ان کے اب مسدود ہے　　ذبح کرنے کو ہر اک موجود ہے

اس ادا سے جائیں گے چھریوں تلے

کاشکے ہوتے نہ ہاتھوں میں پلے

ہجویات

میر تقی میرؔ دہلوی

مثنوی در بیان مرغ بازاں

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے
گرم پر خاش مرغ یاں پائے

پرو پرزا درست یکساں ہے
مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے

مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ
قاز و سارس سے جنگ جسکا ننگ

حوصلہ کس قدر حواصل کا
ذکر کیا کرگس شتردل کا

لات کی گھات گرجو مڑ جاوے
نسر طائر کا رنگ اڑ جاوے

زہرہ ققنس کا اس خطر سے آب
شب نہ سووے ہراس سے سرخاب

بکری سافیل مرغ کو مارا
کب شتر مرغ سے ہوا چارا

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں
مرغ مارے بغل میں آتے ہیں

سرخہ وسبزوار کے سب مرغ
ہیں ثنا گستر ایسے تھے کب مرغ

ہو جوکیں مرغ خانگی کے تئیں
مت سن اس ہرزہ چاگی کے تئیں

لات ماری جو کاٹ کر حلقوم
حیدرآباد تک پڑی ہے دھوم

کھاکے سینے کی مدّعی سووے
نسرواقع کا واقعہ ہو دے

نے ثنا سے بطیں ہی ہیں ترلب
مرغ عیسیٰ مدح خواں ہر شب

ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا ہے
اس کے آگے کنیل پھیکا ہے

کیا عجب ان کی رہگزر کا فرش
ہوں پرافشاں تو ہو خروس عرش

اڑ گیا حلق کا جولڑتے پوست
کی صدا مرغ دوست نے ہی دوست

کیس اس رنگ ہوتے ہیں محسوس
جوں گلستاں میں ہو دیں تاج خروس

شور جنگ آوری کا تا کہسار
کبک کا گھر خروس پر ہے بار

کب ہیں پہلے سے مرغ زریں بال
حسن لاکھے کا سمجھے مرغ خیال

کر سکے وصفِ مرغ کیا کوئی
مرغ آمین کو دعا گوئی

وقر اتنا کہ دیر بچے لیں
جان دے کوئی مجم مرغ نہ دیں

مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا
در الطاف باز کر دیکھا

ربط رکھا بہت انھوں کے ساتھ
ایک پر مرغ کا نہ آیا ہاتھ

یعنی اپنا حریف جب پاوے
پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے

سینہ کیا سینہ بال کیا پرو بال
جیسے چشم خروس آنکھیں لال

آیا حلقوم کے کہ حلق کے پار
پھوٹا چھاتی میں ایک لگ کے دوسار

ہاتھ جس مرغ باز کے تھاوہ
پانی کرنے لگا تر آکر وہ

کچھ تو ٹھہرا تو دم دیا ان نے
تعبیہ کر کے رکھ لیا ان نے

دم سے کیا ہو یہ بیدم ومجروح
قصد پرواز میں تھا مرغ روح

ہو چکا ہوا یہ شور
ڈھلکی گردن گیا وہ سارا زور

پھیلا پانی میں وہ غم جانسوز
دل زدہ پھر ہیں مرغ دست آموز

جانور رنگ باختہ سب ہیں
یعنی حیران فاختہ سب ہیں

مرغ قبلہ نما کو وحشت ہے
بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے

ورنہ اڑ کر کہیں چلا جاتا
دیر اپنے مقام پر آتا

جمع منگل کو پالی کی ہے دھوم
گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم

مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش
جس کو دیکھو تو مرغ درآغوش

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں
سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں

اُن نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے
اُن نے کی نوک یہ کڑکنے لگے

وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج
ساتھ اس کے بدلتے ہیں کج دھج

مرغ کی ایک پرفشانی ہے
ان کی صدرنگ بدزبانی ہے

ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ
ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ

جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں
لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

ایک کے منھ میں مرغ کی منقار　　ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منھ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے　　تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے　　بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سرپر بغل میں مارے مرغ　　لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ
پھر جو روزِ معین آوے گا　　نالہ مرغ سحر سنا دے گا
عالم آوے گا گر دویسا ہی　　گرم ہنگامہ ہوگا ایسا ہی
میران کا نہ ہو دے گو قائل
مرغِ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

مثنوی در ہجو خانۂ خود

کیا لکھوں میرا اپنے گھر کا حال　　اس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک وتیرہ زنداں ہے　　سخت دلتنگ یوسف جاں ہے

کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ　　کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چاردیواری سو جگہ سے خم　　تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی　　آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا تھمے مینھ سقف چھلنی تمام　　چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اس چکش کا علاج کیا کریے　　راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے

جانہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ　　ہے چکش سے تمام ایواں کیچ

آنکھیں بھر لا کے یہ کہیں ہیں سب　　کیونکہ پردا رہے گا یارب اب

جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات　　گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات

باؤ میں کانپتی ہیں جو تھر تھر　　اُن پہ رڈا رکھے کوئی کیونکر

پیچ لے لے کے جوں توں چھوپا ہے　　چھوپا کا ہے کو بلکہ تھوپا ہے

تس کو پھر پرچھتی بھی ہئی نہیں　　ٹوٹا اک بوریا ساڈالو کہیں

ڈھانکو دیوار یا اُٹھا رکھو　　یا ہمارے لیے بچھا رکھو

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق　　سو شکستہ تر از دل عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک　　کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیری ہے خاک

کہیں گھوسوں نے کھود ڈالا ہے　　کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا　　شور ہر کونے میں ہے مچھر کا

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے　　کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے

کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں
پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے
جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے

رکھ کے دیوار ایدھر اودھر سے
لا کے یارب بناؤں کس گھر سے

چار پائی جب اس میں بچھوائی
پہلے چلپاسہ ہی نظر آئی

سام ابرص کہ ہے دوا اے خراج
ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج

پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے
ڈانس ایک ایک جیسے مکھی ہے

آگے اس حجرے کے ہے اک ایوان
وہی اس تنگ خلق کا ہے مکان

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ
اُس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کبھو کوئی سنپو لیا ہے پھرے
کبھی چھت سے ہزار پائے گرے

کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے
کوئی داسا کہیں سے چھوٹا ہے

دبکے مرنا ہمیشہ مد نظر
گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

مٹی تو وہ جو ڈالی چھت پر ہم
تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم

مضطرب ہوکے جو بچھائی بہت
ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت

پرسے اس مینھ میں کرختی ہے
تختا ہوئے یہ تختی ہے

ہوئیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد
چل ستوں سے مکان دے ہے یاد

اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر
گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

جیتے ہیں جب تلک نہیں پہونچے
ورنہ کیا بس ہے جو نہیں پہونچے

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال
پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

طوطا مینا تو ایک بابت ہے
پودنا پھد کے تو قیامت ہے

کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار
تھر تھرا دے جھنبھیری سی دیوار

ہوگیا ہے جو اتفاق ایسا
شاق گزرے کیا کہوں کیسا

ہوکے مضطر لگے ہیں کہنے سب
اڑ جھنجھیری کہ ساون آیا اب

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جان محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ — کہیں، کھسکی تو ہے قیامت تنگ

ایک دن ایک کوا آبیٹھا — بیگماں جیسے ہوا آبیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور — کہ نہ حایط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے — دوڑے اُچھلے کہ ہال ہال چلے

نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا — ایک کالا پہاڑ آن گرا

سان کر خاک لگ گئے دوچار — بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہونگے کھنڈر بھی اس گھر سے — برسے ہے اک خرابی گھردر سے

اکھڑے پکھڑے کو اڑ ٹوٹی وصید — زلفے زنجیر ایک کہنہ حدید

خاک لوہے کو جیسے کھادے پاک — چھیڑ لیجے تو پھر نری ہے خاک

بند رکھتاہوں درجوگھر میں رہوں — قدر کیا گھر کی جبکہ میں ہی نہ ہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور — ہے خرابی سے شہر میں مشہور

جس سے پوچھو اسے بتادے شباب — ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

ایک چھپر ہے شہرہ دلی کا — جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا

بانس کی جادیے تھے سرکنڈے — سودے مینہوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب — پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینھ میں کیوں نہ بھیگیے یکسر — پھونس تو بھی نہیں ہے چھپر پر

مٹی ہوکر گرا ہے سب والا — وہ رہے ہاں جو ہووے ڈھب والا

حال کس کو ہے اولتی کا یاد — مگر اس جھگڑے میں گئی برباد

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا — کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا

ٹپکے دوچار جاتو بند کروں — پیچ کوئی لڑاؤں فند کروں

یاں تو جھانکے ہزار میں تنہا — کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بسکہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی — کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں — کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

مجھ سے کیا واقعی ہوا چارا
آسماں جو پھٹے تو کیا چارا

بان جھینگر تمام چاٹ گئے
بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

تنکے جاندار ہیں جوبیش وکم
تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم

پوچھ مت زند گانی کیسی ہے
ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی
چار پائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو
کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو

ڈیوڑھی کی ہے یہ خوبی در ایسا
چھپراس چونچلے کا گھر، ایسا

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹی رہے ہیں جنکے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شبکو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں

کیڑا ایک ایک پھر کوڑا ہے
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
ایک انگوٹھا دکھاوے انگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں
ناخنوں کی ہیں لال سب کو ریں

ہاتھ تکیے پہ گہ بچھونے پر
کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلہ یا جو پائنتی کے اور
وہیں مسلا کر ایڑیوں کازور

توشک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی
ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان
ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی ندان

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو
پائے پٹی لگائے کونے کو

جب نہ تب پنڈے پر لیے پائے
سیتلا کے سے دانے مرجھائے

سو یہ تنہا نہ بان میں کھٹمل
آنکھ منھ ناک کان میں کھٹمل

کہیں پھڑکا کہ جی سے تاب گئی
آنکھ سے تاپگاہ خواب گئی

ایک ہتھیلی پہ ایک گھائی میں
سیکڑوں ایک چار پائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے — کب تلک یوں ٹٹولتے رہے

یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار — اس میں سی سالہ وہ گری دیوار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ — تھے جو ہمسائے دے ہیں ہکانہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے — جیے رستے میں کوئی ہو بیٹھے

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا — کاش جنگل میں جاکے میں بستا

ہو گھڑی دو گھڑی تو دتکاروں — ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں

چار جاتے ہیں چار آتے ہیں — چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز — کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

وہ جوایواں تھا حجرے کے آگے — اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے

کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا — پانی جوجو میں اُس کے پیٹھ گیا

کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا — ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا

میں تو حیران کار تھا اپنا — کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا

اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر — خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر

چرخ کی کجروی نے پیسا تھا — پر خدا میرا مجھ سے سیدھا تھا

کتنے اک لوگ اس طرف دھائے — یا ملک آسمان سے آئے

مٹی لے لے گئے دو ہاتھوں میں — کام نے شکل پکڑی باتوں میں

صورت اس لڑکے کی نظر آئی — ہم جو مردے تھے جان سی پائی

آنکھ کھولی ادھر اُدھر دیکھا — اس خرابی کو بھر نظر دیکھا

قدرت حق دکھائی دی آکر — یعنی نکلا درست وہ گوہر

داشت کی کوٹھری میں لارکھا — گھر کا غم طاق پر اٹھا رکھا

مومیائی کھلائی کچھ ہلدی — فرصت اُس کو خدا نے دی جلدی

حکم ہوا سن کے دوستداروں کو — پھر بندھا یہ خیال یاروں کو

کہ مری بودباش یاں نہ رہے — گوتصرف میں یہ مکاں نہ رہے

شہر میں جابہم نہ پہونچی کہیں　　چار نا چار پھر رہا میں وہیں
اب وہی گھر ہے بے سرو سایہ　　اور میں ہوں وہی فرومایہ
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس　　خواب راحت ہے یاں سے سوسو کوس
قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں　　رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھہ در کا
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

مثنوی در ہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدّت باراں خراب شدہ بود

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے — اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے

ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں — زندہ در گور ہم کئی تن ہیں

ہے جو سر کوب اک بڑی دیوار — واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار

بخت بد دیکھ سارے پرنالے — اس کے معمار نے اُدھر ڈھالے

اب جو آیا ہے موسم برسات — دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات

صحن میں آب نیزہ بالا ہے — کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے

مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر — ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر

پرتلک ٹنگے تھے کچھ ایک نئے — سو دے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے

دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند — کہ جنہوں نے کیے ہیں جھانکے بند

پھوس کچھ ہے کہیں سو آتا ہے — بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے

اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے — ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے

کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو — باندھتا ہوں مچان رہنے کو

بند جھانکوں کو کیجئے تا کے — یاں تو اک آسمان ٹوٹا ہے

ٹھیکے دینے کو جااڑے ہیں ہم — سر پہ ٹھٹر لیے کھڑے ہیں ہم

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپّر کے — بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تاگلے سب کھڑے ہیں پانی میں — خاک ہے ایسی زندگانی میں

ابتو اپنا بھی حال ہے بدتر — سر پہ گٹھری ہے تسپہ ہے چھپّر

پانی بہ کر جھکا ہے والان   سر پہ رہتا ہے طرۂ ایوان
چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار   جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فگار
متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے   گریۂ زار سو گواراں ہے
گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے   چھت بھی بے اختیار روتی ہے
مینھ یکبار گی جو ٹوٹ پڑا   کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
داسے پایانِ کارٹوٹ گئے   طاقچے بھر رہے تھے پھوٹ گئے
بہ گئے گولے تختے ڈوب گئے   غرض اجزائے سقف خوب گئے
موج خشتی ستون میں پیٹھی   جان غمناک خون میں بیٹھی
لے گیا پیچ و تاب پانی کا   کوٹھری تھی حباب پانی کا
یوں دھنسا گھر کہ بار خاطر تھا   آہ کس کا غبار خاطر تھا
ساری بنیاد پانی نے کاٹی   اینٹ کے گھر کو کردیا ماٹی
جھک گئے سب ستون دربیٹھا   وہی چھپّر کھڑا ہے گھر بیٹھا
جب اجارے پہ آکے چھت ٹھہری   ہم سبھوں میں یہ مصلحت ٹھہری
آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں   کسوٹی پہ بیٹھ کر نکلیں
دبکے دبکے مرنے سے ڈوب مرنا خوب   ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب
سنکے ہراک کے جی میں درآیا   خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا
گھڑی کپڑوں کی میں اٹھائی تھی   سر پہ بھائی کے چار پائی تھی
بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا   اس کا سارا فگار کاندھا تھا
ساتھ کوئی چراغ لے نکلا   کوئی سر پر اجاغ لے نکلا
چھاج کی کرکے کوئی اوٹ چلا   مینھ کے مارے کوئی لوٹ چلا
منھ پہ چھلنے کو ایک نے رویا   ایک نے سرکی کا کیا گھویا
ایک نے چھینکے حال حال لئے   پائے پٹی گلے میں ڈال لیے
ایک نے بوریا لپیٹ لیا   اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا

اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر　　الگنی سب کے ہاتھ میں دے کر
صف کی صف نکلی اس خرابی سے　　تا کہ پہونچیں کہیں شتابی سے
میر جی اس طرح سے آتے ہیں　　جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں
جن نے اس وقت آنکھ کو کھولا　　ہنسکے بے اختیار وہ بولا
سنکے اس بات کو نرائے ہم　　بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم
تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب　　نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب

جس میں خوش یکنفس معاش کریں
طور پر اپنے بودو باش کریں

مثنوی در مذمت برشکال کہ باراں دراں سال بسیار شدہ بود

کیا کہوں ایکی کیسی ہے برسات
جوش باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوند تھمتی نہیں ہے اب کی سال
چرخ گویا ہے آب درغربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے
آسماں چشم واکو ترسے ہے

ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں
تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں

آب میں کوئی بولتا ہی نہیں
آسماں دیدہ کھولتا ہی نہیں

لے زمیں سے ہے تافلک غرقاب
چشمۂ آفتاب ہیں گرداب

خشک بن اب کی بار سبز ہوئے
موش دشتی کے خار سبز ہوئے

ابر کس سیاہ مستی سے
ہوتے جاہیں بلندوپستی سے

لڑکوں نے کی زمانہ سازی ہے
خاک بازی اب آب بازی ہے

ابرکرتا ہے قطرہ افشانی
پانی پانی رہے ہے بارانی

تنک آبی سے جان مت اغراق
ڈوبنے پر ہے کشتی آفاق

عقل میہوں نے سب کی کھوئی ہے
بات باراں نے یاں ڈبوئی ہے

کیسا طوفان مینھ چھایا ہے
زخم دل نے بھی آب اٹھایا ہے

بیٹھے اٹھتے نہیں ہیں بام ودر
یہ خرابی ہے شہر کے اندر

سقف آماج بوند پیکاں ہے
مینھ ہے یا کہ تیر باراں ہے

جیسے دریا اُبلتے دیکھے ہیں
یاں سوپر نالے چلتے دیکھے ہیں

ابر رحمت ہے یا کہ زحمت ہے
ایک عالم غریق رحمت ہے

لے گئے ہیں جہان کو سیلاب
نقشہ عالم کا نقش تھا بر آب

نہ ہے جلسہ نہ ربط باراں ہے
شہر میں ہے تو بادو باراں ہے

روز و شب یاں ہمیشہ جھمکا ہے　　اندنوں رنگ برق چمکا ہے
بڑی بوندوں کی چوٹ سے ڈریے　　سنگباراں جہاں ہوواں مریے
آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں　　مردم آبی پھرتے چلتے ہیں
کتے ڈوبے گئے کہاں ہیں اب　　سگ آبی ہی ہیں جہاں ہیں اب
وسعتِ آب پوچھ مت کچھ یار　　کوچے موجوں کے ہوگئے بازار
معبداب سارے گرتے آتے ہیں　　زاہد خشک ڈوبے جاتے ہیں
تھا ٹھہرنا برابر اُن کے شاق　　مسجدوں میں کیا ہے استغراق
مینھ تو یاں اب لگے ہی رہتے ہیں　　سارے عالم کے کان بہتے ہیں
غرق ہے چڑیا اور گلہری ہے　　خشکی کا جانور بھی بحری ہے
مینھ از بسکہ بہہ بہا ہے گا　　اک جہاں کو ڈبو رہا ہے گا
شعر کی بحر میں بھی ہے پانی　　بہتی پھرتی ہے اب غزلخوانی
لائی پار زندگی کی چالاکی　　آب خشک گہر پہ تمنا کی
ہے زراعت جو پانی نے ماری　　ہوگئی آنجست ترکاری
آب ہے گا جہاں کے سرتاسر　　خوف سے سوکھتا ہے میوۂ تر
مست ہو ہوگئے ہیں مست شراب　　غوطے کھاتے پھرے ہیں عالم آب
مستی ہے اب جو چاہیں سیر آبی　　بط ہے تو ہوئی ہے مرغابی
دست غم اس قدر بہ طغیاں ہے　　کہ ہر اک گوشہ بیچ طوفاں ہے
سیل دیکھے ہے کوہ سار ان کی　　لئے کشتی گدا ہیں بار ان کی
جزر و مد جس کا تا فلک جا ہے　　جو ہے تالاب قہر دریا
ہر طرف ہیں نظر میں ابر سیاہ　　پانی ہے جسطرف کو کریے نگاہ
سیلہا در رکاب دیدہ ماست　　چشم تا کار میکند دریاست
پانی عالم کے تا بسر ہے گا　　خشک مغزوں کا مغز تر ہے گا
خضر کیونکر کے زیست کرتا ہے　　آب حیواں میں پانی مرتا ہے

لکھے کیا میر مینھ کی طغیانی
ہوگئی ہے سیاہی بھی پانی

مثنوی در ہجو نا اہل مسمّی بہ زبان زد عالم

سنیواے اہل سخن بعد از سلام — چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخم حرام
پر نہیں مرغی کا گرم طیر ہے — وہم میں شہباز کا ہم سیر ہے
کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اور سے — بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے
شاعری کو میری ہوگے جانتے — تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے
میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
گرکنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا — ہجو اس کی ہوگئی اس کا کہا
کیا ہو اگر چاند پر پھینکے ہیں خاک — پڑتی ہے اُن سب کے منہ پر میں ہوں پاک
رہیو شاید کچھ نہیں میرا گناہ — مدعی بے ہیچ ہے یہ روسیاہ
تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا — درد مند عاشق و دلریش تھا
پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب — غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تب
ایسے کتنے ہیں جواب شاعر بنے — مدتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے
ایک باتوں سے مری آدم ہوا — اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا
ایک نے دیواں کی میرے نقل لی — اس دوانے کی کنھوں نے عقل لی
ایک میرے طرز پر کہنے لگا — دوسرا پیرو مرا رہنے لگا
سارے عالم میں ہو نمیں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا
دور سے کرتا ہوں بیٹھا سبکی دید — کوئی سر کھینچو ہے میرا مستفید
کوئی بے تہ گو نہ جانے میری قدر — بائیں ہے پائیں آخر صدر صدر
ہے گی شخصیت خدا کی اور سے — ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے
ایک لچا دے جو اک عمدہ کو بھوگ — تو اُسے کیا کچھ طرف جانیگے لوگ

جو بڑے ہیں دے ہی آخر ہیں بڑے — ایسے لچے بہت پھرتے ہیں پڑے

شہر میں آیا میں بعد از بست سال — گم تھایاں سررشتۂ قال ومقال

کتنے اک نومشق تھے گرم سخن — سوبچارے آپ ہی ناآگاہ فن

مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر — مردۂ صد سال سا بے نورتر

کاسہ لیس مایۂ خبث وحسود — قلیۂ دہ روز سے بھی بد نمود

آتے اچھا ہے جواُس کو روک دو — ورنہ منھ دیکھو و وہیں اوک دو

باپ اس کا سخت ناداں نادرست — کوڑی کی سی گندی بلی قاق دست

ایک جا آیا شتر قد گھر گیا — واں شتر غمزہ ساجھ سے کرگیا

رہ گیا میں پی کے لوہو کا سا گھونٹ — یعنی دیکھوں بیٹھے ہے کس کل یہ اونٹ

اس تحمل پر نہ کی مطلق نظر — خار پہلو کا ہوا ہر جالچر

جب لگا ہے ناچنے مستی سے خوب — تب لیا میں نے قلم کے زیر چوب

مستی اُسکی ساری اب جھڑجائیگی — دھوم ساری گلیوں میں پڑجائیگی

جب بڑوں سے مارنا ہموار کھائیں — کج خرامی سے تب اپنی باز آئیں

راہ سیدھا ہو کے چلتا ہے بلے — اونٹ جب آیا پہاڑوں کے تلے

اونٹ کی خلقت پہ ہے قدرت کو ناز — اس کی خلقت کم ہے کیا اے بے نیاز

ہیئت اُس کی مضحکہ ہے سوانگ ہے — جید عوج بن عنق کی ٹانگ ہے

سر کے تیئں اُس کے جو دیکھوں کر نگاہ — بانس پر ایک اوندھی ہانڈی ہے سیاہ

تیرہ رو مضحک سراپا زور ہے — دم اگر ہو وے تو پھر لنگور ہے

شکل وصورت دیکھ کر حیراں رہو — بیگماں سب ملکے لگ لگ ہی کہو

بیٹھے تو بیٹھا ہے گویا بوتمار — آتے جاتے جاویں اس کو جوتے مار

چال جب چلنے لگے سر جھاڑ کر — پاؤں کو پہلے رکھے منھ پھاڑ کر

بال و پر رکھتا نہیں بے پاؤ سر — ورنہ تھا یہ بھی عجائب جانور

ایک دن بیٹھے تھے یاں ذات شریف — وارد اُس دن ہوگئے کتنے ظریف

ایک بولا دیکھ کر حیران ہو — یہ جزائر کا کوئی حیوان ہو
یاں تو ایسا جانور دیکھا نہیں — سر کہیں ہے پاؤں اس کے ہیں کہیں
ایک کے آیا مکوڑا وھم میں — ایک کے مور سواری فہم میں
ایک نے ہنس کر دیا اسکو ڈھکیل — اور بولا اے تری قدرت کے کھیل
کیسا اعجوبہ نیا پہونچا ہے یاں — چونچ ہو تو ہے شتر مرغ کلاں
ایک بولا کر کے چشمک میری اور — واہ صاحب جانور پالا ہے زور
ایک دن باہر تو ہو لیکر کھڑے — یہ اچنبھے یوں نہیں رہتے پڑے
جائے اُس وحشی کا ٹک وسواس بھی — چوک بھی ہے پاس یہ نسناس بھی
اس کو یاروں نے غرض کیا کیا کہا — لیک یہ خرنا شخص ہی رہا
یہ جو ہے موشک ودان وشور چشم — موشن شتی چہرہ وشبکور چشم
بے سبب سر گرم کیں ہمسے ہوا — مستحق لعنت عالم ہوا
چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا — پاس کبتک کیجئے نام ونگ گا
یاں زبردستوں کو دعویٰ کھا گیا — یہ چھپا رستم کہاں سے آگیا
ناقباحت فہم کو دعولے بڑا — ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا
ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے — چیونٹی کا کیا جگر جو منھ پہ آئے
جنگ ہاتھی کی ہو گو اُس کو ہوس — پر اُسے ہے موت کا ریلا ہی بس
ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی — پودنے کی سی ہے اُس کی ضامنی
میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد — پر کمی کرتا ہے یہ ابن زیاد
قبلہ کہتے کہتے ہاجی ہوگیا — پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہوگیا
رشک شہرت سے مری مرنے لگا — میری عزت کا حسد کرنے لگا
لگ گئی چپ اس کو میرے شور سے — یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اور سے
یہ قبول خاطر لطف سخن — دے ہے کب سبکو خدائے ذوالمنن
ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز وطور — اب چنانچہ میرو مرزا کا ہے دور

خصمی وہ کریئے کہ ہو معقول خلق ‎ ‎ نے اُنھوں سے جو کہ ہو مقبول خلق
دشمنی تھی اُس کو مجھ سے کیا ضرور ‎ ‎ حیف ایسی عقل لعنت یہ شعور
ہوں جو میں پر تو فگن تو ہے یہ کیا ‎ ‎ خُر کے آگے ذرہ کب ٹھہرا رہا
خون دل آشام ہیں جو صبح و شام ‎ ‎ دے بھی لیتے ہیں ادب سے میرا نام
یہ مری رہ کا نہ حائل ہو سکے ‎ ‎ یہ موئی جو کیا مقابل ہو سکے
میں نہ الٹی اجگروں کی دم میں صف ‎ ‎ ادھر موئی رہی چھپکلی کیا ہو طرف
رکھتی ہے میری شرافت اشتہار ‎ ‎ گو یہ ناسید کہے ہے کیا چمار
ہجو کی جو اُن نے میں کیا دب گیا ‎ ‎ بھونکنے پر سگ کے ہاتھی کب گیا
ننگ ہے میری توجہ اس طرف ‎ ‎ حیف ہے میلانِ دریا سوئے کف
وار دتی سے ہے اُس کے مجھ کو شرم ‎ ‎ تب تو میں باتیں کروں ہوں نرم نرم
ان عزیزوں کا نہایت پاس ہے ‎ ‎ ورنہ یہ ملعون کیا کناس ہے
جو نہ سمجھا تیغ خامے کی ہے پاس ‎ ‎ کاٹوں گا یوں جس طرح کٹتی ہے گھاس
جب سے لے آیا قدم اپنا یہ شوم ‎ ‎ تب سے ویراں ہوگئی یہ مرز بوم
ایک بدیمنی ہی ہے گی بوم میں ‎ ‎ لطف وہ پاتے ہیں ہم اس شوم میں
دید نی ہے قدرت رب ودود ‎ ‎ ایسی اچرچ کم ہی ہوتی ہے نمود
کرتی ہے تعظیم میری کائنات ‎ ‎ لعنت اس پر ہوتی ہے دن اور رات
یا بلا ہے یہ سج ---گزک ‎ ‎ میرے وتکارے گئے چھیڑے دبک
میری ہیبت سے نکل جاتا ہے موت ‎ ‎ دشمنی کی اُن نے اپنی ما-------
بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر ‎ ‎ شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر
نا مبارک ہی نہیں سادہ بھی ہے ‎ ‎ الو ہے اور الو کی مادہ بھی ہے
عقل سے کس طرح ہووے بہرہ ور ‎ ‎ ہے کسو حافظ کا نطفہ پاچہ خر
پروہ حافظ جو ہو قرآں خوان قبر ‎ ‎ اس سے لیں کار تلاوت گو بہ جبر
جھڑ گیا ہووے دماغ اُس کا تمام ‎ ‎ پڑھتے پڑھتے شور سے ہر صبح وشام

وہ خرف جورو سے جا یک جا ہوا   ایسا الو ماخرا پیدا ہوا

دیکھ کر اُن کے خرامی ہائے سرد   ایک کوّے نے کی تقلید تدرد

کودکر چلنے لگا آخر کو راہ   اپنی بھی رفتار بھولا رو سیاہ

کاشکے ہوویں مخدر شیخ وشاب   چھوئے سے منھ جو پکارے کیا ہی باب

گوکہ یہ کچھن کرے کیا مال ہے   آگے میرے ---کا سا بال ہے

چاہوں گا جب پھینک ہی دونگا اکھاڑ   ایسی ......سیکڑوں ڈالی ہیں جھاڑ

بدنمائی اُس کی ہے بیساختہ   کیا ہے یاں میش بچہ انداختہ

دیکھ اسے یاد آوے قدرت کا ملہ   کیا بلا ہے مادہ خوکِ حاملہ

گرگ گردن خوک چشم وغوک سر   غول صحرائی کا بچہ ہے مگر

چار سکھیاں کہہ کے شاعر ہوگیا   اس فن مشکل کا ماہر ہوگیا

باپ کو اُن نے بنا رکھا ہے اوت   ہیں کہاں ایسے سعاد تمند پوت

کم ہوا ہے گا جو اُس کا زور پا   جانتا ہے اس کو پیری کا عصا

کچھ نہیں معلوم اس کو سرکار   تپ تو ٹھہرایا ہے اس کو راز دار

اس زنازادے نے جواب واکیا   پہلے ماں کا راز ہی رسوا کیا

ایک ہی شب کے تئیں جلوادیے   یار ماں کے باپ کو دکھلا دیے

پھر حقیقی باپ سے جا کر ملا   اس مجازی کا کیا اس سے گلا

پیسے اس کے کھاکے جب کتا ہوا   یاں کسی تقریب آپیدا ہوا

تب سے روز وشب اسی کے ساتھ ہے   اس خرف کی داڑھی اُس کے ہاتھ ہے

بس قلم نفریں ہے میری بس اُسے   ہے دماغ بحث پاجی اب کسے

رکھ زباں کیدھر گیا تیرا مزاج

پوچ گو بہترے پھرتے ہیں پواج

ہجو عاقل نام نا کسے کہ بسگاں انسے تمام داشت

اک جو لچر کو رزق کی وسعت سی ہوگئی
تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہوگئی

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش
چیچڑی کی طرح شام وسحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی طبع ولطافت وہ برطرف
کتا بغل میں مارے لگا پرنے ہر طرف

دنکارو کتے کو تو لہو اپنا وہ پیے
ہے اس کی استخواں شکنی کتوں کے لئے

یا جھوٹے ہاتھ کتے کو مارنا نہ تھا کبھی
یا کتوں سے چٹایا ہے اب اپنے منھ کو بھی

کتے ہیں پاس کتے ہیں حبیب و کنار میں
کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں

آیا جو ایک روز وہ بے تہ چلا ہوا
کتا ازار اُسکے سے نکلا بندھا ہوا

یک سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا
پھر کھول اُس کے منھ کے تئیں چومنے لگا

ایسی بھی ہم نے دیکھی نہیں کتوں کی ہوس
گردن میں اپنے ڈالے پھر روز وشب مرس ا

ٹکڑا ہو جس کے ہاتھ میں یہ اس کا یار ہے
جیسے سگ سرائے سگِ ہر سوار ہے

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑ باٹ کا
دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

تھکتا ہے پھر جو کرتے ہوئے دوڑ اور دھپاڑ
لیتا ہے بے دماغ ہو لوگوں کے کپڑے پھاڑ

جو ہڈیوں پہ لڑتا رہا ہو بسانِ سگ
ہو آدمیت اس کو بھلا کس مقام لگ

انسان کو انس کتے سے اتنا ہوا ہے کب
ناپاک اس کو جانیں ہیں پاکیزہ لوگ سب

اصحاب کہف کا بھی جو سگ ہو تو ہے وہ سگ
نجم الدیں کے بھی کتے کو کتا کہے ہے جگ

کر سگ تخلص اپنا جو آیا بروے کار
اکراہ سگ لوند سے کرنے لگا دیار

رہتے نہیں نفور تو سگبانِ بے شعور
کھاتے میں وہ بھی کہتے ہیں کتے کو دوڑ دور

کیا جانیے کہ یہ گہہ سگ کیا متاع ہے
بازار میں جو دیکھے ہے سگ کو سماع ہے

آدم گری اُڑا رکھی حرف وسخن گیا
دیکھا جو خوب تو سگ دیوانہ بن گیا

دم لابہ جو دبے تو لگے کرنے بدخصال
دوڑے دگر نہ کاٹنے کو کتے کی مثال

کمبخت یہ غریب جو ساپائے یہ
مرگھٹ کے کتے کی سی طرح پھاڑ کھائے

درمدعی ہونگ بھی قوی دل قوی نصیب
پھر آگے اُس کے سوکھی سی بلی ہے یہ غریب

رہتا ہے سخت شیفتہ کتوں کے بال کا
پلا یہ ہے کہے تو کسی کتے وال کا

کتوں کی لے کے زردو سیاہ سپید پشم
کس کس طرح سے دیکھتا ہے داب داب چشم

کتوں کے شوق میں جو یہ آتش ہے زیرپا
کہتا ہے اس کو اب سگ پاسوختہ بجا

اس کی پلیدی شہرۂ ہر شہر ہی رہی
کتے کے کاٹے کی سی اسے لہر ہی رہی

دلی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں
ہمسایوں کی جنھوں کے لئے کھائیں گالیاں

وہ مرگئیں بودیر رہا روتا غمزدہ
پشتی کے پیچھے پھر نہ ہنسا ٹک ستمزدہ

لونکی کا گرم حم جو رہا سوکھ نخ ہوا
برفی کی تعزیت میں سگ روئے یخ ہوا

بلی جو پالتا تو بھلا ایک بات تھی
آئین میں اس کی دوستی ایماں کے ساتھ تھی

توراں کے لوگ ہودیں کہ ہوں اہل اصفہان
کتا تو کشتنی ہے سب اسلامیوں کے ہاں

جس کو خدا خراب کرے پھر وہ کیا کرے
کیونکر زباں نکالے نہ جوں سگ پھرا کرے

آواز دے دے کتوں کو توڑے ہے اپنی جان
مرجائے گا پہ بھونکتے ہی بھونکتے ندان

کتوں کے پیچھے پھرتا ہے گلیوں میں دور ہو
یہ سب ہے اس لئے کہ ہر اک جائے شور ہو

اس وضع ساختہ کے ہوں احمق فریفتہ
بہرہ ہے جن کو عقل سے دے کیوں ہوں شفتہ

ہے اس طرح کے معرکہ گیروں سے پر جہاں
بہتر ہے ایسے کتے نچاتے پھرے ہیں یاں

مثنوی مسمّٰی بہ تنبیہ الجہال

صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف
کسب کرتے جنکی طبعیں تھیں لطیف

تھے تمیز درمیاں انصاف تھا
خاروخس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا

دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو
کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو

پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دین
کوئی حاجت اُس سے وابستہ نہیں

گر چمار اس کار خانہ میں نہ ہو
ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو

چارونا چار اس کنے جانا پڑے
کوڑیاں دے جوتی گھٹوانا پڑے

حاجت اس فرقے سے مطلق یاں نہیں
جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں

یہ تو دنیا میں ہے اس فن کا کمال
دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال

کذب ہو جس جائے رونق بخش سمع
واں کی دینداری رکھو اور دلکو جمع

جھوٹ آوے اسقدر جب درمیاں
کو یقین ایمان کیسا دیں کہاں

ہم تلک تھی بھی وہی رسم قدیم
یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم

پیار کرتے تھے انہیں استاد فن
ان کے ہوتے رہبر راہِ سخن

جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار
شاعری کا ہے کوتھی ان کا شعار

نکتہ پر دازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا

الغرض یاروں نے قیدیں اٹھا
جو کوئی آیا اُسے دی پاس جا

تک نہ استعداد سے کی گفتگو
کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو

چار سکھیاں کہہ کے دیں ناکس کے ہاتھ
پھر اسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ

آپ بیٹھے صدر میں وہ دست چپ
کرنے لاگے شاعری سے حرف گپ

بولے ان کو آج کل سے ہے خیال
ذہن اُن کا تیزی رکھتا ہے کمال

ہو رہیں گے کچھ اگر صحبت رہی
اور ہم سے بھی انہیں الفت رہی

جب ہوا ثابت وہ ان کا مستفید
سب نے جانا اس کو شاگرد رشید

کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن
آگے اُستادوں کے ہوگرم سخن

اُن کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا
صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا

نیم قد اٹھ کے یہ سننے لگے
جاوبیجا سر کے تیئں دھننے لگے

وہ سراپا جہل ناگہہ وقت کار
ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار

سرمیں رکھ کر دعویٰ طبع لطیف
میرومرزا کا ہوا آخر حریف

کیسی کیسی یوں گئیں طبعیں بباد
آفریں شاگرد و رحمت اوستاد

جب تلک یہاں تھی تمیز زشت ونیک
کاہے کویوں شعر کہتا تھا ہر ایک

اہل فن کی رہتی تھی سبکو تلاش
اُن کے ہاں کرتے تھے جاکر بودوباش

جو کہ خودسر رکھے اُستادوں سے عار
اُن کے تیئں ہرگز نہ ہوتا اعتبار

زندگی بلکہ اُنھوں پر شاق تھی
ہاتھ گر لگ جاتے تھے شلاق تھی

حکایت

شائق فن تھا وزیر اصفہان
ایک دن آیا ہلالی! اُس کے ہاں

حاجبان در سے ہو آگاہ کار
کی اشارت تا اُسے دیں گھر میں بار

عزت و تعظیم کی حد سے زیادہ
پاس لے مسند پہ بیٹھا شاد شاد

اُن نے کھینچی اُس کی مرزائی بہت
بیٹھے بیٹھے رات جب آئی بہت

شعر کی تقریب لاکر درمیاں
کرنے لاگا شاعری کا امتحاں

شعر خوانی کی پڑھا سوتھا غلط
سنتے ہی بھڑکا وہ شعلہ کی نمط

غصہ ہو بولا کہ ہاں فراش و چوب
کھینچ لامیداں میں کی شلاق خوب

اسقدر مارا کہ بے دم ہوگیا — سوج دست وپاہراک ھٹم ہوگیا
کھینچ کر ڈلوا دیا دربار میں — یہ خبر پہونچی جو ہر بازار میں
وارث اُس کے لے گئے آرات کو — جب بخود آیا تو پایا بات کو
یعنی دستور زماں دشمن نہ تھا — یاوہ کچھ نا آشنائے فن نہ تھا
ورنہ شیوہ اس کا ہے لطف وکرم — جائزے میں دے ہے دینار و درم
مجھکو کیوں شلاق کرتا اتنی شب — کا ہے کو بدنام ہوتا بے سبب
پس مجھے ہے تربیت اپنی ضرور — جاکے بیٹھوں اک سرآمد کے حضور
صحبت اکثر رکھوں اس استاد سے — شاید اس کی دولت ارشاد سے
پہونچے اک رتبہ کو میری قیل وقال — ہو مجھے اس فن میں یک گونہ کمال
اُٹھ کے آیا مولوی جامی کنے — مشق کی یک چند اس نامی کنے
پھر گیا اک دن درِدستور پر — حاجب درگاہ نے کی جا خبر
کاے امیر اس روز کا شلاق خوار — آج در اوپر ہے پھر خواہانِ بار
کی اشارت سدرہ کوئی نہ ہو — قصد ہے برخود کا تو آنے دو
سامنے آیا تو کی نیچی نظر — دھوپ میں جلتا رہا تو اک پہر
بعد ازاں ایمائے ابروکی کہ ہاں — صحن ہی میں سے ہوا وہ مدح خواں
پھر وہیں سے دے صلہ رخصت کیا — اک مصاحب نے جگر کر کر کہا
اگلی صحبت کی تھی عزت اسقدر — سو ہوئی شلاق حد سے بیشتر
ابکی اس کو جائزہ دیگر گراں — تونے فرمایا مرخص واں سے داں
میں نہ سمجھا یہ کہ وہ کیا تھا یہ کیا — درجواب اس برگزیدہ نے کہا
ایسی ہی ہوتی ہیں تضحیک سلف — وست ہوتو اُن کے تئیں کریے تلف
اسقدر اس کا تنبہ تھا ضرور — تاکہ پہونچے یہ خبر نزدیک ودور
جو سُنے سوخود سری سے باز آئے — تربیت ہونے کو اُستادوں کی جائے
ورنہ کرتا پوچ گوئی ہر دبنگ — رفتہ رفتہ شاعری ہوجاتی ننگ

تب جو میں شلاق کی یہ خام تھا
اب جو آیا لائق انعام تھا

قصہ کو تاہ تھی تمیز درمیاں
تنگ ہے کرم مزابل پر بھی بھاں

بے تمیزی سے ہے رائج ابتری
جس کو دیکھو خود نمائی خود سری

نے بیاں کا ہے سلیقہ نے زباں
اسپہ ہے ہر ایک سحبان بیان

بس قلم وقت زباں بازی نہیں
چپ کہ دور ان سخن سازی نہیں

کون حرفِ خوب کو کرتا ہے گوش
بات کی فہمید کا ہے کسکو ہوش

بے تمیزوں سے بھرا ہے سب جہاں
ہے دماغ حرف ہمکو بھی کہاں

مثنوی اژدرنامہ

یہ موذی کئی ناخبردار فن — نئی ناگنیں جنکے نیکوں پہ پھن

نہیں جانتی ہوں میں مارسیاہ — زبانہ ہے آتش کا میری نگاہ

نفس ہے مرا افعی پیچدار — گیا جس سے خصم قوی سن کو مار

جدھر بھر نظر دیکھوں لگ جائے آگ — دم دم کشی لب پہ کھیلیں ہیں ناگ

جہاں میں ہوں وہ جاہے پر شروشور — عصا سے چلے راہ واں مار و مور

مری آنکھ سے زہر ٹپکا کیا — جلا آگے میرے کبھو کب دیا

سن اس ماجرے کو سبھوں نے کہا — کہاں کیچوے یہ کہاں اژدہا

نہ خصمی مری اژدروں سے ہوئی — طرف مجھ سے ہو جونک کیا اودھ موئی

اگر شور زاغاں سے ڈرجائے مار — تو کیا اجگروں کار ہے اعتبار

نہ کس طور اژدر کو تکواسہ ہو — حریف اُس کے سوکھی سی چلپاسہ ہو

کہاں چھپکلی اژد ہے سے لڑی — کس اژدر پہ ایسی قیامت پڑی

ہزار اجگر اندوہ سے جائے لٹ — ولے ایسے کیڑے مکوڑے ہیں چٹ

جہاں شور اژدر سے ہے دھوم دھام — کوئی کنسلائی سے نکلے ہے کام

بہ ظاہر یہ لائے تو ہیں پرنکال — ولے ہوں گے انکے جیوں کے وبال

حریفی انہوں سے ہو اژدر کی کب — وہ کھینچے جو یکدم تو پھنکا ہیں سب

حکایت بعینہ یہ دل سے ہے میر — سرراہ کہتا تھا جو اک فقیر

کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم — درندوں کے بھی دل تھے اُس سے دونیم

نکلتے نہ تھے اُس طرف ہو کے شیر — پلنگ ونمرواں رہتے تھے دیر

جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب — شغال اور روبہ کا واں کیا حساب

وہ صحرا تھا اس کے سبب ہولناک — دم اس کے نے واں کی اڑادی تھی خاک
نکلتا تھا جب بہر برگ ونوا — شجر کے شجر ہوتے تھے تب ہوا
کہاں سایہ اس جا وسبزہ کہاں — درخت اُس کے چاٹے رہے رتھے نہ واں
صدا جب مہیب اس کی ہوتی بلند — جگر چاک گرتے ہوا سے پرند
درندوں کے برجانہ رہتے حواس — چرندے مکانوں سے ہوتے نہ تھے
وحوش اُس بیاباں میں جاتے نہ تھے — طیور آشیانوں میں آتے نہ تھے
کبھو اُس کی رہ میں جو اٹھتا غبار — تو وہ دشت تھا ایک تاریک غار
پہونچتا تھا گردوں تلک شور وشر — ہوا صاف ہوتی نہ دو دوپہر
رہا کرتی کوسوں تلک اس کی دھوم — نہ اُس راہ آتا کوئی جز سموم
ہوئے ساکنانِ بیاباں تبنگ — اٹھے کوہ ووادی سے شیرو پلنگ
گئی لومڑی ایک سوکھی ہوئی — کسواور جنگل میں بھوکی ہوئی
گل میں جویاں کے کھلے اُس کے لب — ہوئی واں کی اعیان گرم غضب
خراطین و خرموش وموش وشغال — اس اژدر کو کرم جنس اپنی خیال
رواں ساتھ اس کے شبانہ ہوئے — کئی گرگٹ آگے روانہ ہوئے
رعونت سے مینڈھک اُچھلتے چلے — بلوں میں سے چوہے نکلتے چلے
قریب اُس بیاباں کے جسدم گئے — انھوں میں سے آگے بہت کم گئے
قضارا وہ آفت تھی سرگرم سیر — چلے آتے تھے بھاگتے وحش وطیر
اُس آشوب سے دست دپا گم کئے — فراموش سب نے سرودم کئے
لگا ڈرنے خرموش ساپہلوان — ہوا مضطرب کیچوا سا جوان
وہ گرگٹ کہ جس کو تھی گردن کشی — ہوئی خوف سے اسپہ طاری غشی
قدم خوک سے گرد کا جل گیا — بھروسا تھا گیدڑ پہ سوٹل گیا
جہاں پہلواں موش رستم معاش — لگا کرنے میدان میں بل تلاش
کہ سوراخ پاوے تو روپوش ہو — یہ تشویش یکدم فراموش ہو

دے چھوڑ تاکب ہے خصم قوی   کہ ہو خوفِ جاں سے کوئی منزوی
پراگندگی تھی اس انبوہ میں   کہ گونجی بلائے سیہ کوہ میں
اس آواز سے جی نکل ہی گئے   جو ثابت قدم تھے بچل ہی گئے
سیہ جب ہوا ہوگئے منھ سفید   ہوئے مدّعی جان سے نا اُمید
بھرا ایک دم اُن نے واکروہاں   کہ پایا اُس انبوہ کو نیم جاں
دم دیگر اُن سے نہ کوئی رہا   وہی دشت خالی وہی اژدہا
زبانہ وہی آگ کا چار اور   ہوا گرم ویسی ہی ویسا ہی شور
وہی دم کشی شام سے تاسحر   اُسی ہولناکی سے وہ دشت دور
گئی یہ خبر جس بیابان میں   رہی سُدھ نہ کچھ واں کے سُکان میں
کنھوں نے کبھی مُنھ نہ ایدھر کیا   نہ پھر نام اس اژدہے کا لیا
مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ   طرف ہوں مری اُنکی طاقت ہے یہ
جو مجھ کو ہو کچھ بھی انہوں کا خیال   تو یہ مار گیری کریں کیا مجال
تو کیا ہوا انہوں سے بہت دور میں   ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں
مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے   جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر   گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

مثنوی در مذمت آئینہ دار

آج سے مجھ کو نہیں رنج وملال
جب سے نکلے بال تب سے ہے یہ حال

موشگانوں کا نہیں ہے نام اب
مدعی شعر ہیں حجام اب

ان سے کین اک مو برابر بھی نہیں
جلف اشرافوں کے ہمسر بھی نہیں

یہ ہوئے سر چھڑھ کے یہ موئے دماغ
دود ہوجانے لگے سوئے دماغ

ہوگئے گرم سخن تب تو قلم
ورنہ یوں بیہودہ کب نکلا ہے دم

ایسے مونڈے میں نے کتنے بے شعور
ہے حجامت اس بھی فرقہ کی ضرور

یاں نہ سید کچھ ہے نے نائی ہے شرط
ہو کسو کسوت میں دانائی ہے شرط

سگ کو نجم الدین کے سرداری ہوئی
نوح کے بیٹے کی وہ خواری ہوئی

میرو مرزا میں حکم ہو وے خرد
نے کی نائی جن پہ سب کا دست رد

سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر
نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے سیر شیر

مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت
یاں تانی داں عجالت ہے بہت

جس جگہ میں نے رکھی منہ میں زباں
ہوتے اُس جا گہ جو مرزا بیگماں

استرے کانوں میں اپنے باندھ کر
کب کے اب تک گھسگئے ہوتے ادھر

ان کمینوں کا گلہ کیا کیجئے
ایسے دس پیدا ہوں گر نہ لیجئے

کہتے ہیں سرگرم بیباکی ہے یہ
ہوں تو ہوں ناپاک کیا پاکی ہے یہ

لکھئے اس فرقہ کے اب تا چند ذم
خط بنادیں ایسا کریے کف قلم

گرچہ ان کو کہتے ہیں آئینہ دار
لیک انکا منھ نہ دیکھیں کاش یار

صاف قینچی پر اُنہیں چڑھوایئے
گرنمد ہواس میں پھر ہو جایئے

چاہو ہواس قوم کی کیا شرح حال
آگے ہی آویں گے جتنے ہونگے بال

اک سفید اُن کو نہیں چھنے کی تک
ہوتے ہیں دشمن یہ کالے بال تک

کیا کہوں کیسے ہیں اوندھے یہ لچر
کیجئے اصلاح عاید ہو وے شر

کھر چیں ایسا سر کہ کردیں پائمال
سیدھیاں جب سن لیں تب لیں اُلٹے بال

معتبر اُن کے جو حجامی ہیں اب
ہند میں وہ تیرہ روشامی ہیں اب

کوئی لے جائے جو حاجت غسل کی
چلو چلو پانی پردیتے ہیں جی

لعنتیں کرتے ہی گزرے اُسکو واں
غسل میں فرصت تشہد کی کہاں

بیٹھے جامے خانے میں کیا غسل کر
جیب شاگردوں نے واں رکھی کتر

لیک پھر اُجرت کے اوپر جنگ ہے
لات ہے گالی ہے پھر سر چنگ ہے

اس سقاوے میں گیا تھا اک حریف
اس کی فی الجملہ طبیعت تھی ظریف

دھوکے پاجامہ نہانے بھی گیا
یکطرف پھر پائخانہ بھی گیا

غسل کے پیچھے جو منھ گھر کو کیا
ہاتھ نائی کے سوا پیسا دیا

نائی نے پوچھا کہ پیسا یا ٹکا
دمڑی یہ کیسی ہے میں قرباں گیا

ہنسکے بولے تو نہ بدلے جائیو
یاں ہگا بھی ہے اُسے اٹھوائیو

چوہڑے نائی ہیں سارے ایکذات
ان میں ہے بدذات جو ہو نیک ذات

آیا اک نائی زنانا سا نظر
ہاتھ میں نلوا لیے بے پاوسر

میں کہا آتا ہے نلوا کام کیا
بولتا ہے آگے سے بدنام کیا

اس میں لوطیوں کی ڈال کر
مونڈتے ہیں اک اک بال کر

ہاتھ رکھئے تو ---------ہوانہیں
ضبط کی شاید نہ طاقت ہوا نہیں

عذر اگرچہ واشلک بھی یاں نہیں
لیک اک دن اس میں اپنی جاں نہیں

دھکے چڑھ جاویں نہ جانے کیسے کے
جی بھی جاوے واسطے دو پیسے کے

سنکے اس سے ایسی اچرن بات کو
میں کہا لعنت تری اوقات کو

کاٹئے اُن کے تئیں مثل گزر
پنڈے کے ہلکے ہیں اکثر پاچہ خر

بعضے بعضے ان میں سے جراح ہیں
بحرخون وریم کے ملاح ہیں

زرد و زنگاری کوئی ڈبا ہے ساتھ حیض کے سے ایک دولتے ہیں ہاتھ
موم ڈالیں تیل میں مرہم کریں پھر مسیحائی کا دم اس پر بھریں
پھیر پگڑی بیٹھیں ایسی شان سے آئے ہیں گویا ابھی ایران سے
باپ سے اپنے اگر پیسے نہ پائیں داغ کو اُس کے جراحت کر دکھائیں
بعضے بعضے ان میں رعنا ہیں اگر مشعلچی ہیں بھگت کے بیشتر
رنڈی گت ناچے یہ اُسکا منھ دکھائیں پاپا مشعل لیے مجلس میں جائیں
روشنی لے دوڑتے ہیں وقت شام گھورتے ہیں کرکے اندھیارا مدام
تیل کی کپی لیے خوش ہیں کھڑے ایک بھڑوے ہوتے ہیں چکنے گھڑے
لگ چلیں تو ہینگے جیسے موچنے کھائیں جب سر میں لگیں تب سوچنے
چھیڑیو تو مغز بھی لے جائیں گے سر کے تیئں سہلاکے بھیجا کھائینگے

بے حقیقت ہیں نہیں شایان کار
صحبت ان سے بگڑی ہے پایان کار

مثنوی در ہجو اکول

ایک ہے پر خور آشنا بے پیر — سینہ سوراخ جس سے ہو کف گیر
صدی منی دیگ ہے شکم اُس کا — نفس اژدہا ہے دم اُس کا
آنت شیطان کی ہے اُسکی آنت — دانت اُس کا ہے ہاتھی کا سا دانت
خستۂ جوع وہ جو آوے نہار — منہ ہے گویا کہ زخم دامن دار
شکل مت پوچھ کھانے کا ہے بلی — منہ ہے چھپیوں سے جیسے روٹی جلی
گال کلیجے سے پھر توے سے سیاہ — کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ
نوند کابی جو کھول جائے لیٹ — آہنیں ہے تنور اُس کا پیٹ
راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی — چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی
کھینچے بادرچیوں کے کیا کیا ناز — کتری گئی اُس کے چوتڑوں پر پیاز
کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے — چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے
وقت کھانے کے ہاتھ سے اس کا — قاب پر نان پنجہ کش گویا
کیا وہ دو پیازہ کھاکے ہو تازہ — اک نوالا ملا ہے دو پیازہ
گوشت ہانڈی بھرا ہے خنک میں — ہنڈیاں گویا تھیں اس کی خشک میں
خام طمعی سے اک کرے ہے آہ — دیکھ کر شبکو نان ہالۂ ماہ
نہ ٹلے دیکھ کر وہ قاب پلاؤ — منہ ہے منہ بیٹھا گرچہ کھاوے گھاؤ
کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہے — لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہے
نہیں پہونچے جو کھانا کھانے لگ — ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ
بھوکھ کا باؤلا جو آتا ہے — لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے
دھوں میں دشمنوں سے بھی وہ لئیم — جائے گھل مل اگر سنے ہے حلیم

آش بغرا یہ مار بھی کھاوے	اس میں گوبوخرا نکل جاوے
کسی مفلس کے گھر جو جاتا ہے	کچھ نہیں نختیں ہی کھاتا ہے
بھوکھ سے جب کہ غصے میں آوے	بزکو ہی کی طرح جھنجھلاوے
ٹھڈیوں کو نگہہ سے کھاجاوے	چنے لو ہے کے بھی چبا جاوے
دہر کا جلنا آگ سے مانوں	بھوک اُسکی جلے تو میں جانوں
نکلے بازار میں وہ جب چربوز	سر ہی پھوڑے ہے دیکھ کر تربوز
گھاس پات اور کانس کھاتا ہے	نیشکر پر وہ بانس کھاتا ہے
اُس کے آنے کی سن کے بازاری	کرتے ہیں سودوں کی خریداری
کوئی تختہ کرے ہے دوکاں کو	کوئی لاوے بلا گزرباں کو
کنجڑے ڈھانکے ہیں ساگ پات اپنا	تکتے ہیں بنیئے داؤ گھات اپنا
کہ مبادا ادھر کو آجاوے	سودے یکسو ہمیں نہ کھاجاوے
انیٹ پتھر بھی کھاگزر جاوے	الغرض پیٹ اپنا بھر جاوے
کیا کیا جینے کی کہئے چکھتا ہے	لیک پیٹ اُس کو مارے رکھتا ہے
پیٹ اپنا بڑا جو پاتا ہے	گوہ تک کا بھی جیف کھاتا ہے
وہ قضارا ہوا مرا مہماں	کھاگئی اس کی میز بانی جان
گھر میں جو کچھ تھا بیچ منگوایا	کھانا اس کے لئے میں پکوایا
کتنا کھانا بیاں کروں تجھ سے	جس پہ سو میہماں کروں تجھ سے
مجھ سے تھی روز گار سے ان بن	خوب کھانا تو تجھ پہ ہے روشن
چار من گا جروں کا قلیہ تھا	وہ منی دیگ بیچ ولیہ تھا
روٹیاں کس قدر بتاؤں میں	جس کو دوچار سال کھاؤں میں
چاہ کر کے گرا جو وہ بلاغ	مدد روح اشعث طماغ
تھی ابھی روٹیوں کی جیٹ کی جیٹ	میں رہا کہتا کھاگیا وہ سمیٹ
کھانا کوئی اور کیا کہے اُس کا	سارے منہ دیکھتے رہے اُس کا

جب مریگا وہ بھوکھ کا روگی روح تو شے کی روٹی میں ہوگی
کھانے کی بوجو ناک میں پیٹھے مرگیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں
بھوکے اس کا جوجی نکل جاوے
گور میں بھی کفن نگل جاوے

مثنوی دیگر در بیان کذب

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے

اے جھوٹھ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شہہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا

اے جھوٹھ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے
اے جھوٹھ تو غضب ہے قیامت ہی قہر ہے

اے جھوٹھ رفتہ رفتہ ترا ہو گیا رواج
تیری متاع باب ہے ہر چار سو میں آج

اے جھوٹھ کیا کہوں کہ بلا ریز سر ہے تو
اے جھوٹھ سچ یہ ہے کہ عجب فتنہ گر ہے تو

اے جھوٹھ تیرے شہر میں ہیں تابعین بھی
مر جائے کیوں کوئی دے سچ بولیں نے کبھی

کہنے سے آج اُن کے کوئی دل نہ شاد ہو
فردا کہیں تو اس سے قیامت مراد ہو

وعدے گھڑی کے پہروں کے سب آزما چکے
برسوں تک انتظار کیا جی ہی جا چکے

اے جھوٹھ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہے جیسے غنچہ زباں تو تہ زباں

یوسف کہ تھا نبی وصداقت شعار تھا
پھر حُسن ظاہری سے بھی باغ وبہار تھا

پایانِ کار تیرے سبب چاک پیرہن
زنداں میں جاکے برسوں رہا چھوڑ کر وطن

اے جھوٹھ تو تو ایک دلاویز ہے بلا
آشوب گاہ تجھ سے زمانہ رہا سدا

کس جانکنی سے کوہکنی کوہکن نے کی
تصویر کھود شیریں کی پیش نظر رکھی

نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے
اب صبح وشام غنچۂ مقصود دل کھلے

دلالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا
دو باتوں میں وہ عاشق دل خستہ مر گیا

اے جھوٹھ تجھ سے فتنے ہزاروں اُٹھا گئے
ہنگامہ و فسادہی ہر سو رہا کیے

اے جھوٹھ راستی سے نہیں گفتگو کہیں
کہنے کو ہاں کہیں ہیں حقیقت میں ہے نہیں

اے جھوٹھ اس طرح بہت جی سے جا چکے
وعدوں میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آ چکے

اے جھوٹھ اس زمانے میں کیونکہ چلے معاش
ہے تنگ جھوٹھ بولنے سے عرصۂ تلاش

سردار جس سے سب متعلق ہے کار بار
سچ بولنا ہے اس کے تئیں سخت ننگ و عار

پھر سب مدار کار دروغی و مفتری
صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

جھوٹا سوار دولت ابھی کا ہے یہ امیر
ورنہ قسم کسو کی بھی تھی حرف بار گیر

مشکل حصول کام ہے یاں حاصل کلام
باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

اے جوشؔ دل مرا بھی بہت دردناک ہے
ان کادیوں سے صبح نمط جیب چاک ہے

اک فرد وتخطی تھی مری ایک شخص پاس
دیکھا جو خوب اُسکو تو مطلق نہیں حواس

تھا میں فقیر پر نہ گیا شاہ کے حضور
اتنے لیے کہ رتبہ عزت مرا ہے دور

آداب سلطنت سے نہیں مجھ کو رابطہ
حرکت نہ ہوئے مجھ سے کوئی غیر ضابطہ

مرزائی مجھ سے کھنچتی نہیں ہر عزیز کی
پھر شعر و شاعری بھی نہیں ہے تمیز کی

صحبت خدا ہی جانے پڑے کیسی اتفاق
کیا بات آوے بیچ میں بے رتبگی ہی شاق

میں مضطرب گھر اس کے گیا اُٹھ کے پانچ بار
کہنے لگا زباں سے یہ ہوتے ہی وہ دوچار

تقصیر میری اس میں نہ کریگا کچھ خیال
صاحب کہیں خموشی کروں میں یہ کیا مجال

لیکن یہ حرف اس بھی سیہ رو کا رکھئے یاد
انداز سے یہ لوگ سخن کرتے ہیں زیاد

بہتری ایسی فردیں یہ رکھتے ہی جیب میں
رکھتے ہیں یوہیں لوگوں کو برسوں فریب میں

دکھلاؤں گا چلا ہوں سوال آپ کا لیے
میں نے کہا فقیر کہو کس طرح تجھے

بولا نہ ہوگا سعی میں ایدھر سے کچھ قصور
پھر دیکھیے کہ پردے سے کرتا ہے کیا ظہور

اک آدھ ایسی بات بنا کر کھسک گیا
دل اس خبر کے سننے سے میرا دھڑک گیا

یعنی وہ ابکی آن کے کچھ دیویگا شتاب
دل جمع رکھیں کاہیکو کرتے ہیں اضطراب

دوچار بار آیا بھی وہ پر نہ کچھ ہوا
مجھ کو جو اضطرار تھا میں بے اجل موا

مدت مدید گزری مجھے کرتے انتظار
خجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار

اس فرد وتخطی کو ہے یہ ماہ ہفتمیں
تنخواہ کا نہیں ہے ٹھکانا ابھی کہیں

آیا جو وہ لطیفہ غیبی اب اپنے گھر
میں مضطرب ہو آپ گیا ملنے اُسکے گھر

بارے نہ اتفاق ہوا یہ کہ ہو ملاپ
کھویا تھا اضطرار سے عز و وقار آپ

گھر آ کے ایک بھائی کو بھیجا پیام دے　　آئے وے اس کے پاس سے جو کچھ جواب دے

حضرت سے کہیو پہلے بہت بندگی مری　　پھر کہیو اب اترتی ہے شرمندگی مری

دو چار دن میں بھیجے گا کچھ گھر ہی آپ کے　　در پے نہ اتنے ہو جیئے میرے ملاپ کے

تب سے دے بھائی جاتے ہیں ہر روز صبح و شام　　ابتک تو ملتوی ہے زمانے زدے کا کام

دن دیکھتے ہیں وعدے کے بھی ہیں بہت قریب　　پھر ترک شہر کیجئے گا کہہ کے یا نصیب

برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے وعید
سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

مثنویات شکارنامہ

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شکارنامۂ اوّل

چلا آصف الدولہ بہر شکار
نہادِ بیاباں سے اُٹھا غبار

روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ
لگا کانپنے ڈر سے شیر وپلنگ

طیور آشیانوں سے جانے لگے
وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

سن آواز شیرانِ نرڈر گئے
پلنگ ونمر خوف سے مر گئے

جہاں ببرآیا نظیر صید تھا
بیاباں اُسی پہن سے قید تھا

گئے مست ہاتھی مکانوں کو چھوڑ
دیے پنجۂ شیرنلیوں سے توڑ

نہ دیکھا نہ ہم نے سنا یہ شکار
کہ بکری ساہاتھی کو لیتے ہیں مار

پلنگانِ صحرا کے دل خوں کئے
نہنگانِ دریا ہوئے مرجیے

کہاں سہل مارے گئے نرہ شیر
لگے بکریوں کو پکڑتے بھی دیر

ہوئے لشکری جبکہ سرگرم گشت
مقید ہوئے مست فیلان دشت

گئے جانور دشت خالی رہے
بیابان جھاڑے گئے تو کہے

عجب ترہے یہ صید کرنیکا ڈھنگ
کہ چورنگ ہاتھی ہوئے بیدرنگ

نہ چیتل نہ پاڑھا نہ ارناشیر
ہوئے گولیاں کھاکے یک لخت ڈھیر

وندروں کا پیدانہ نام ونشاں
نہ شیر ژیان و نہ پیلِ دماں

کبھو فیل وشتی نہ جکڑے گئے
نہ یوں بھیڑ بکری سے پکڑے گئے

سُنا جس طرف فیل وشتی کا میل
رواں فوج اُدھر کو ہوئی سیل سیل

اگر ٹک بھی اٹکا تو مارا گیا
پڑے سیکڑوں پھاند چارا گیا

وگر سرکشی سے کی استادگی　　تو پیش آئی اک طرفہ افتاد کی

پہاڑ ایک ہاتھی مقابل ہوا　　بزورا آمدو شد کا حائل ہوا

جٹے دونوں دے دیو میدان میں　　اٹھا شور محشر بیابان میں

جہاں دونوں فیلوں کی تھی کبر زنی　　شتر مرغ سے واں نہ ہو پرزنی

جو اس مار کھانے پہ اکڑا رہا　　کئی روز رسوں سے جکڑا رہا

رہے کس طرح پھٹ گیا تھا جگر　　موا دوپہر میں لہو موت کر

مگر سرکشی سے نہ اپنی ہٹا　　نہ میدان میں تک دبا تک گھٹا

اشارہ ہوا اُس کے چورنگ کا　　سبھوں کو ارادہ ہوا جنگ کا

برسنے لگا مینھ تیروں کا زور　　ہوا فیل باراں کا جنگل میں شور

لگی پڑنے بجلی سی تیغ سپاہ　　پریشان ہو جیسے ابرِ سیاہ

نہایت وہ ہاتھی ہوا لخت لخت　　گرایوں کہ جیوں پارۂ کوہ سخت

رکھا لا کے لشکر میں اثنائے راہ　　سراُس کا کٹا جیسے برج سیاہ

رہے کہتے اس دن عجب سب ہی یہ　　سرِفیل ہے سر شب ہے یہ

اگر دیو ہیں سرگرانی کے ساتھ　　نہ اس تیرگی وکلانی کے ساتھ

دماں خشمگیں جیسے آتش یہ تھا　　مگر فیل سردیو سرکش یہ تھا

گوزن اور ہرنوں کی کیا دیجے شرح　　گئے شیر مارے سو کتوں کی طرح

گیادشت دردشت شور شکار　　ہوئے گرگ آہو کے اوپر سوار

ہرن جھکیتوں میں رہے گھومتے　　کھپے فیل بیلوں ہی میں جھومتے

برابر رہے گورو شیر ژیاں　　برابر تھا دونوں کو وسواس جاں

گئے پیشتر چھوڑ نخچیرگہ　　شغالوں کی روباہ بازی تھی یہ

اس اوقات سے جوکہ بیہوش تھے　　بھیرو بنہ جاگہ خرگوش تھے

اگر ریچھ نکلا تو تھا سو بسو　　بہت مضطرب تھا وہ آشفتہ ہو

قلندر سپاہی پے جاہوئے　　لیے اس کو سر درگریباں ہوئے

علف آب گوں تیغ کا پھر ہوا — کہیں پاؤں اس کے کہیں سر ہوا

موے اس طرح حضرت بوحمید — کہ جوں ہوتے ہیں گے بڑے سے پلید

گرے پشت سوئے فلک خاک پر — اک انبوہ تھا جسم نا پاک پر

گئے لادنے فیل لشکری — یہی ذات تھی لائق برتری

کروں صید ماہی کا کیا میں بیاں — کہ فیلوں، پہ تھے تودہ تودہ رواں

پڑے سیکڑوں دام تالاب میں — نہ چھوٹی تنک خاک اُس آب میں

رہے گوشت ہی پکتے ہر صبح وشام — جواں کھا گئے مرغ وماہی تمام

ہوا حائل راہ بحرِ عمیق — کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق

قریب آکے اُتری یہ خائف تھی فوج — کہ بیڈول اُٹھتی تھی ہر ایک موج

مہیب اور آلودۂ خاک آب — بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب

غضب لجہ خیزی بلاجوش پر — تلاطم قیامت لیے دوش پر

چلے بس تو کچھ کوئی چارہ کرے — مگر دیکھ ہی کر کنارہ کرے

تردد میں ہر اک کہ ہوں کیونکہ پار — کنارے پہ سرگشتہ گرداب دار

رواں آب ایسی روانی کے ساتھ — کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ

لگے پاؤں چلنے جہاں شور تھا — کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا

تامل سے اقبال نواب دیکھ — توقف کیا پہلے تو آب دیکھ

پھر اُس پار جاکر اشارہ کیا — کہ لشکر نے دو ہیں گزارا کیا

شباشب اُترنے لگے لشکری — نہ جوش آب کا وہ نہ ویسی تری

وہ سوتا جگاتا تھا جس کا خطر — اٹھا شور سے فوج کے چونک کر

نشہ اُسکے سر سے اتر سا گیا — چڑھائی سے لشکر کے ڈر سا گیا

کچھ اک ناویں لے کچھ شجر کاٹ کر — شتابی سے دریا کے تیئں پاٹ کر

اُتر نے لگا لشکر بیکراں — کراں تا کراں تھی یہ محشر عیاں

سلامت ہوا پار سب اژدہام — رہے دنگ خضر علیہ السلام

شکار اُس کنارے بھی تھا بیشتر ہوئے صیدیاں کے جگر ریش تر
گئے ارنے مارے سو مانند فیل ہوا خون جنگل میں ان کا سبیل
رہے گور راتوں کے تئیں جاگتے گئے ببر کو سوں تلک بھاگتے
پکڑ لائے چیتے گوزن اور گور عصا سے چلے راہ یاں مار و مور
بہت ہم نے دیکھے وزیر وشہاں شکار ایسے دستور سے تھا کہاں
نمکخوار مجھ سے تو ہیں گے ہزار پہ میرا بھی ہونا ہے یہاں یادگار
کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام شکار اُسکے دشمن رہیں صبح و شام

غزل میر کوئی کہا چاہیئے
ٹک اس بھی زمیں پر رہا چاہیئے

غزل

ہم وحشیوں پہ کچھ ہو کا ہے کو یار ہے تو اے ترک صید پیشہ کس کا شکار ہے تو
پہونچی قریب شاہد نخچیر گاہ اُس کی جوں صید خوں گرفتہ دل بیقرار ہے تو
دل تجھ تلک رسائی مشکل ہے چشم تر سے عسرالعبور کیسے دریا کے پار ہے تو
شہری ہیں اُسکی آنکھیں کیا تجھ کو انسے نسبت اے آہوئے بیاباں اچھا گنوار ہے تو
کیا صبح جلوہ گر ہو خوبی کے آگے تیری اے گل دم تبسم باغ و بہار ہے تو
یہاں دو قدم ہی چلنا بن سر دیئے نہ ہووے اے راہ عشق کتنی مشکل گزار ہے تو

لیتا ہے تجھ سے عبرت جو کوئی دیکھتا ہے
کیا میرا اس گلی میں بے اعتبار ہے تو

باز قدم رنجہ فرمودن آصف الدّولہ بہادر روزِ دیگر برائے شکار

چلا پھر بھی نواب گردوں شکار / اسد باؤ کے گھوڑے پر ہو سوار
روانہ ہوئی فوج دریا مثال / نہنگوں کی اب کھینچی جاویگی کھال
گیا شور تا آسمانِ بریں / ہوئی گرد افواج گردوں قریں
زمیں ہوگئی جائے خوف وخطر / فلک کو لگے دیکھنے شیر نر
چڑھا بسکہ دریائے فوج گراں / اُتر ہاتھیوں کی گئیں مستیاں
دبی چپ لگا چلنے بھیڑوں کی چال / پریشاں ہے گرگ بغل زن کا حال
پلنگوں نے کہسار سے راہ لی / نہنگوں نے دریا کی جاتھاہ لی
بجیرے جو تھے دام سے چھا گئے / کشف نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے
درندے پرندے چرندے کھپے / گزندوں کے منہ گرد نیچے ڈھپے
تلف جانور ہیں جہاں کے تہاں / گوزن اور گور اور آہو کہاں
رہے گوریک شاخ ویک سوغزال / تزلزل میں ہیں کیا شجر کیا نہال
شغال اور روباہ و خرگوش سے / نہیں بحث کچھ یہ ہیں بیہوش سے
کوئی شور سن سن کے گھبرائے ہے / کوئی کان ڈالے چلا جائے ہے
کوئی ڈھونڈھتا ہے بیاباں میں جھاڑ / کوئی چاہے ہے پھاندجاؤں پہاڑ
کہ شاید یہ اودھر نہ ہو کل مکل / کوئی دن جیے اس بلا سے نکل
پھرے مضطرب ہو کے شیر غریں / کہ بیشوں میں تھے یا کماں یا کمیں
نکلتا ہے گفتار پر بے حواس / ہزبر جگر خوار سب ہیں اوداس

کیا کام ڈرتے گئے پھٹ جگر
بن آئی ہی مر مر رہیں ہیں نمر

اگر خرس تھا مغتر و بد معاش
لگا موش خانے کی کرنے تلاش

دگر ببر ہے پیش وپس ہے نگاہ
نہیں سوجھتی بجواسی سے راہ

مبادا شکاری شگان رکاب
گریں آکے مجھ تک بھی پہونچیں شتاب

ہوا آب زہرہ وہ شیری گئی
جگرڈر سے ہے خوں دلیری گئی

ہوئی صید بندی کی جنگل میں دھوم
گرے فیل جیسے گھٹا آوے جھوم

بیاباں میں چھایا ہے کیا ابر مرگ
برستی ہے گولی بسان تگرگ

لڑائی نہیں ہوں جو مصروف جنگ
اڑیں رنجکیں اڑتے دشمن کے رنگ

جو آتا ہے پلٹن کو کچھ ولولہ
چلے ہے کوئی توپ ہے زلزلہ

اگر جائے تھی اس کی کوہِ گراں
گیا شیر پھکنے بھی جاگہ سے یہاں

نہ دل مردہے ببرو گرم شتاب
دل شیر برفی بھی ڈر سے ہے آب

نہ رنجک کے اڑنے کا اچھا ہی طور
ہوا آن ہی میں زمانہ کچھ اور

ہوئی گرم آتش زنی سے ہوا
رکھا آب میں جاکے لک لک نے پا

محیط آبگیروں کے تھے مرد کار
موے مالک الحزن چندیں ہزار

بہت دام پانی کی جانب جھکے
کھڑے رہ گئے رودکیا کیا رکے

ٹھٹک سونس گھڑیاں رہ رہ گئے
مگرمچھ، نہ جانے کدھر بہ گئے

نہ قشقل نہ سلی نہ سرخاب ہے
تمام ان کے لوہے سے سرخ آب ہے

عجب روغن قاز ملتے تھے یار
کہ قازون کو لیتے ہوا میں سے مار

منگاتے تھے بطخ کی چربی ظریف
سودہ چربی اب پھینکدیں ہیں حریف

ہوئے کتنے اقسام ماہی شکار
نہ آوے قسم کھائے بن اعتبار

مگر مرگ ماہی تھی جالوں کے بیچ
کہ یوں مچھلیاں سب نکالیں اینچ

نہ ارنب ہے جنگل میں نے سوسمار
کوئی بدوی کیا کھاوے پروردگار

کلنگوں کی الٹی گئی صف کی صف
ہوئے بیچ میں قرقرے بھی تلف

نہ جب سے گئے سبزہ کھا کھا کے چیت　　بڑے ویسے ہی آئے کھیتوں میں کھیت
بٹیراور تیتر کا ہے کیا شمار　　کہ باز آگئے جرے کرتے شکار
ہوا زرد سبزک بہت دل میں ڈر　　نمدمو ہوا گرد سے شانہ سر
خطرناک تھا دشت کیا کہیے مور　　دبایوں پھر جیسے دبتا ہے چور
نہ پاڑھا نہ نیلا نہ چیتل کوئی　　بنوں میں جووں تھی گیا جل کوئی

کوئی میر صاحب غزل یاں کہو
پرایسی کہ ویسی کسی سے نہ ہو

غزل

کیا کشت وخوں پہ اندنوں میلان یار ہے
ہر جائے پوچھتا ہے کہ یاں کچھ شکار ہے

جاتا ہے اس کشندے کی جانب چلا ہوا
صیداجل رسیدہ ہے دل بیقرار ہے

آنکھیں جو میری باز ہیں جو صید بسملی
اس ترک صید بند کا یہ انتظار ہے

عزت جو اُس گلی میں ہے اپنی نہ پوچھیے
جب جایئے تو خشم ہے گالی ہے مار ہے

جانیں چلی گئیں ہیں بہت قلب گاہ سے
تو رہ کے جا کہ راہ ابھی پُر غبار ہے

ہے زلف دردے یار سے ہر لحظ بحث یہاں
یہ وجہ ہے کہ شعر مرا پیچدار ہے

کم اختلاطی کا ہے گلہ یار سے عبث
کسی کشتۂ وفا سے بہت اسکو پیار ہے

گل گل شگفتگی ہے ترے چہرے سے عیاں
کچھ آج میری جان قیامت بہار ہے

کیا میرتم کو گریۂ شب سے ہے گفتگو
طوفان میری پلکوں کا سرور کنار ہے

نشیب و فراز بیاباں کو سن
جوذی ہوش ہیں دے تو ہوتے ہیں سن

چڑھو آسماں پر جو آوے چڑھاؤ
پھر اُترو تو تحت الثریٰ ہی کو جاؤ

جو اس میں کہیں ہووے لغزش تو خیر
کہ درپیش ہے اور عالم کی سیر

زمیں ضیق ازبس ہوئی یک بیک
نہ پھیلا سکا پاؤں گزپا تنگ

ملے پر سے پر تھے ہوا میں کلنگ
کہ چلنے لگے یاں سے تیرو تفنگ

قیامت تھی آفت تھی ہر ایک چوٹ
لگے جس کے پھر تھاو ہیں لوٹ پوٹ

ہوئے خون اس جمع کے بید رنگ
ہوا کا ہوا اور اکدم میں رنگ

نہ پر تھا نہ پرزا نہ بازو نہ پا
کنھوں نے بھی پوچھا نہ یوں تھا یہ کیا

نہ زردی کو دیکھا نہ پایا کبود
نکالا ہے لوگوں نے پانی سے دود

سپہ کی بلا ترک تازی رہی — نہ سارس کی وہ سرفرازی رہی
کمانداز مردم سے چارہ گیا — کسو کھیت پر مفت مارا گیا
نہ جو فیل دشتی کی مستی گئی — وہیں مٹ گیا اُس کی ہستی گئی
سنانوں کی نوکوں پہ پھر بٹ گیا — وہ کوہ گراں سنگ سب چھٹ گیا
بہت جانور چھوڑ آکھر گئے — لگی دوں بہت جل گئے مر گئے
اگر بن ہے گویا نبا ہے اُسے — کرے قصدواں کا تو کیونکر گھسے
مگر زور سے کچھ نکلتا ہے کام — بہت رنج کھینچے سے چلتا ہے کام
خریدار دستار سر خار بن — زمیں پر رکھو پاؤں کانٹوں کو چن
کئی گام یوں راہ چلنا پڑے — پھر اُس دامگہ سے نکلنا پڑے
تو آگے بیاباں پر خار ہے — کہیں جھاڑ بوٹا کہیں غار ہے
اگر اس میں پانی نظر پڑگیا — کنارہ پہ اس کے یہ چڑھ کر گیا
ہوا حال اپنا پریشاں بہت — پھرے مضطرب اور حیراں بہت
ترائی جوواں سے گزرنا ہوا — کہاروں کے سر چڑھ اُترنا ہوا
بیابانِ وحشت اثر پُر خطر — یہی ڈر ہے ڈر کیا اِدھر کیا اُدھر
جہاں تک نظر جائے سوکھی ہے کانس — اگر سبزہ بھی تھا تو تھوہڑ کا بانس
کہیں دل رکے بند ہو جائے دم — لکھوں کیا نیستاں ہی تھے یک قلم
چلے باد دن کو تو ہو سائیں سائیں — پڑے رات تو پھر کرے بھائیں بھائیں
نہ سبزہ نہ کھیتی نہ آب رواں — کوئی شیر غراں کہ پیل وہاں
سو وہ شیر مارا گیا مثل سگ — وہ ہاتھی پکڑ لائے بے تاز و تگ
کوئی دشت ایسا کہ تھا سبزہ زار — ہوا دلکش و جرگہ جرگہ شکار
اگر آہو گیری کا ہوتا نہ عیب — تو وہ ہم بھی رکھ لیتے بیشک درِیب
مسطح زمیں میل درمیل تھی — نہ دریاچہ تھا کوئی نہ جھیل تھی
اگر آگیا رود خانہ کہیں — نہ دلخواہ تھا واں سے جانا کہیں

بڑا لطف تھا سیر میں گشت میں — نہ تھی وخت رزحیف اس دشت میں

ہوا اک جبل سامنے سے سیاہ — اسی کی طرف کو پڑی سب کو راہ

عجب لطف کا تھا وہ کوہ گراں — کہ صد چشمہ کا اس میں پانی رواں

شجر سبزو پتھر بہت صاف تھے — سبھی جیسے الماس شفاف تھے

ہوا ایک باراس جبل سے بلند — ہوا پر بچھی اکی یزدی پرند

پہروں سے بارش لگی ہونے زور — رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور

ہوئے خیمے پانی کے اوپر حباب — سب اسباب لوگوں کا تھا زیر آب

نہ پوچھ اور اسباب مردم کا حال — نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال

قنات اور تنبوبسر سب گئے — کھڑے تھے جو کندلے اتر سب گئے

بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا — اگر فرش بستر تھا تھیلا ہوا

ہوا سرداز بس ہوئی ایک بار — کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سی پار

پھرے باد سے لوگ منہ ڈھانپتے — جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے

رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار — ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار

بہت پیر جب جی کو تجنے لگے — جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے

تہہ میغ خورشید نہاں ہوا — نہ دیکھا مگر روے جاناں ہوا

بہت اسب واشتر موئے پاؤں پیٹ — نکالا اُنہیں خیمہ گہہ سے گھسیٹ

غزل میریاں کوئی موزوں کرو — تامل کرو دل جگر خوں کرو

غزل

وہ دل شکار آن جو نکلا شکار کو
انداز یک نگاہ سے مارا ہزار کو

چلنا پڑے ہے رکھ کے قدم تیغ تیز پر
کس ڈھب سے کاٹیں اس رہِ مشکل گزار کو

اڑنے لگے ہے باد میں تو جانگرا ہے پھر
خجلت ہی اُس کی زلف سے ہے تیر مار کو

سو بار منہ چڑھاتے ہو کچھ بولتے نہیں
یہ بات کیا چڑھو ہو کہے اپنی بار کو

آتا نہیں نظر کہ حصول اُمید ہو
کیا تھام تھام رکھیے دلِ بیقرار کو

جیتے رہے تو اس سے ہم آغوش ہونگے ہم
لبریز گل سے دیکھیں گے جیب و کنار کو

کیا سمجھے خوبی میری خراش جبیں کی تو
اس کام کو دکھا کسی اُستاد کار کو

ایسے ستم کیے کہ گیا جی سے میں ندان
تک منصفی سے دیکھو پھر انصاف یار کو

بولا کہ مجھ کرتی ہے بدنام گور میر
ہے خوب اگر مٹاوے کوئی اس مزار کو

کسو بن میں ارنوں کا پاکر نشاں
لگی جانے ہر صبح فوج گراں

مقابل ہوا آکے جوں فیل مست
اگر فیل تھا تو ہوا اسکا پست

غضب ہے خدا کا کوئی اس کے چوٹ
اگر اسپ اشتر ہے تو لوٹ پوٹ

نہ خوک اُس کی جنگل میں گھیرے ہے راہ
نہ شیر اس کی جانب کرے ہے نگاہ

بڑی دیر جنگل میں دوڑا پھرا
لیا زیر بندوق آخر گرا

لگی بہنے شمشیر جدول شعار
لگے قیمہ کرنے جوانانِ کار

بہت ایسے مارے بہت کٹ گئے
نظر کرکے ہیبت جگر پھٹ گئے

کسو بن میں رونق نہ پائی گئی
پھر اس پر جو ایسی ادائی گئی

جگرواں کے شیروں کے پھٹ پھٹگئے
بیابان سے کرگدن ہٹ گئے

نہ فیلوں میں سدھ بدھ نہ شیروں میں زور
نہ چیتوں کو جا گہ نہ گوروں کو گور

نہ بوٹی کو چھوڑا نہ باقی ہے جھاڑ
پہاڑوں کو راہوں سے ڈالا اُکھاڑ

پرندہ جہاں پر نہ سکتا تھا مار
ہوا رہکلے توپ کا واں گزار

نکل شیر جنگل سے حیراں ہوئے
اڑا ہے جو تھے صاف میداں ہوئے

جہاں چلتے پھرتے نہ تھے مار و مور
چلے پہروں واں تیر بندوق زور

شغال اور خرگوش و ہم روبہاں
شکاری سگوں نے کیے نوش جاں

ہوا پر جو تھے مرغ پرواز میں
گرے سیکڑوں ایک آواز میں

بہت جانور کھا گئے کر کباب
ہوئے آشیانے ہزاروں خراب

حواصل تھا کیا جو کہوں تھا کہیں
کہ تعداد کشتوں کی پاتے نہیں

بہت مضطرب جھکیتوں میں پھرے
سلامت نہ آخر گئے برسرے

اُنہوں ہی میں سیمرغ بھی تھا مگر
کہ پر مارتا ہی نہیں کوہ پر

نہیں فیل مرغ اور شتر مرغ اب
کہ بعضوں کے طعموں کے کام آئے سب

کسو بن میں تھے نیستاں اور کانس
چلے راہ واں لے نہ سکتے تھے سانس

برس مینھ دو دن میں کھل بھی گیا
ولیکن ہے کہرا لطیفہ نیا

کہ اندھیر تھا جیسے ظاہر ہو دود
ہوئے ہونٹھ سردی سے سب کے کبود

بلا دھوم سے کوئی گھبرا پڑے
جنہیں دیکھو وے کانپتے ہیں کھڑے

ہوا سرد ہو کر گئی جان مار
اُٹھایا بڑا لطفِ سیرد شکار

دل اُس دود تیرہ سے گھبرا گیا
کہیں آگ دیکھی تو جی آ گیا

یہی چال تھی ایک دو چار کوس
ہوا ٹھنڈی پڑی ایسی اوس

کسو کوہ کے پاس نکلی جو راہ
گئی کوہ کی تیغ تک کم نگاہ

بلندی تھی اُس کوہ کی تافلک
نگہ جاتے ہی جاتے جاتی تھی تھک

نہ اس رنگ سے صید ہو نگے کہیں
ہوئی خون کے رنگ رنگیں زمیں

جہاں دام اور دو کی تھی بود و باش
لگے چوک لوگوں نے کی واں معاش

ہوا ایک جنگل میں آکر گزر
کسو کو نہ تھی واں کسو کی خبر

تراکم قیامت تھا اشجار کا
ستم پھر ہوائے ستمگار کا

کہ اس مرتبہ باردو سرد تھی
ہوئے سن مگر برف پرورد تھی

کوئی خار بن حایل رہ ہوا
پھٹے پیرہن ہوش سب ہوا

درختانِ بے برگ دبر بدنما
نہ اک شاخ پر مرغ رنگیں نوا

بہت سرملائے بہم تھے شجر
ولیکن نہ پایا کنھوں نے ثمر

نہ قمری ہوئی نالہ پرواز تک
نہ بلبل کی واں آئی آوازتک

یہی کل مکل تھی یہی کشمکش
پھرے مارتے سرکو دیوانہ وش

اگر شاخ جاگہ سے اپنی ہلی
تو کانٹے سی ہم رہرواں پر چلی

جو اس دشت میں تھا کوئی صید بھی
سو آگے ہی وہ ہوگیا قید بھی

رہائی ہی مقصود تھی واں سے یار
پڑی اپنی سب کو کہاں کا شکار

نہ چھوٹی تھی جاگہ قدم دار بھی
نہ اُٹھتا تھا اک نالۂ زار بھی

کہ دل کو کسو کے لگے جوں خدنگ
ہوئے ایسے سنسان جنگل میں تنگ

نکلنا ہوا کھینچ کر یہ عذاب
ملا بیشتر ایک نہ دار آب

رواں تھا کسو کی طرف تندو تیز
ہوا اس کے چلنے کی تھی پیش خیز

حباب اس کا چشمک زناں موج پر
کہ یوں گرم جاتے ہیں اہل نظر

طلبگار کرتے نہیں سادگی
نہ ہو جوں گہرایسی استاد گی

کنارے پہ اُس کے اُترنا ہوا
دو بالا ہوئی ٹھنڈ مرنا ہوا

نہ رکھتے تھے جوں رند مفلس لباس
نہ اُن سے ہوا اپنے جامہ کا پاس

غزل کہنے کی یہ بھی جاخوب ہے
جو اچھی ہو موزوں تو کیا خوب ہے

غزل

حیف اس شکار پیشہ کو ہم سے خبر نہیں
ہم ہیں شکار خستہ ہمارے جگر نہیں

ہم خاک منہ سے ملکے پھرے جیسے آرسی
افسوس ہے کہ روئے دل یار ادھر نہیں

آنکھیں نکال اُسکے قدم کے تلے رکھیں
تو بھی ہمارے حال پہ اس کو نظر نہیں

کیا کیجئے جو نہ کیجئے انداز دام کا
گلزار کے تو قابل پرواز پر نہیں

نکلی پڑے ہے میان سے کاہیکو ہر گھڑی
لاگ اُس کی تیغ تیز کو ہم سے اگر نہیں

سر رکھ کے اس کی تیغ تلے مرچکو شتاب
یاں پاؤں پیٹ پیٹ کے مرنا ہنر نہیں

آنکھیں ہیں اس کی راہ پہ جوں نقش پا ہزار
پر میر اس کو کچھ سر سیرو سفر نہیں

بے کتنے زوروں میں بانک دپٹے
جواں اس سے آگے بھی جاکر ڈٹے

نہنگ اس طرف کے نجاروں کے سن
پلنگ ان بنوں سے چلے سر کو دھن

گیا سیکڑوں کوس شور شکار
رہے ٹھور حیوان یکجا ہزار

چلا باز چھاتی کو کھولے جہاں
پرندہ رہا وہم کا بے گماں

زمیں گرد جرہ ہے کیا تیز بال
رکھا جنے اُٹھتے ہی مرغ خیال

فلک سیر شاہیں کی پرواز دیکھ
لگے جوں نگہ جاکے انداز دیکھ

نہ جھاڑا گیا نسر طائر سے سر
گھٹا کر گس چرخ چھوٹا نہ پر

رواں جس گھڑی ہوتی فوج گراں
بھیرونبہ ہر طرف سے عیاں

زمیں پر قدم کوئی کیونکر دھرے
بیاباں فراخی سے تنگی کرے

کوئی شعبہ آیا اگر درمیاں
ہوا شور لشکر سے محشر عیاں

بلندی وپستی تھی اتنی کڈھب
کہ گاہے زمیں گہ فلک پر تھے سب

کوئی نالہ کھولا اگر آگیا
تو اپنا کیا بھیر کوئی پاگیا

گرے یاں رہے یاں یہی چال تھی
جہاں درجہاں خلق پامال تھی

ہوا دن تو یوں کھینچتے رنج شام
گئی رات چوروں کے ڈر میں تمام

کبھو ہے کوئی کون آتا ہے یہ
پکارے کوئی کون جاتا ہے یہ

لگے آنکھ کیڑوں کے تئیں زور ہو
پھر آرام سے رات کو سو رہو

ہوا خیمہ گہ دامن کوہ سب
رہا آکے نواب واں تین شب

قریب ایک ٹیا پہاڑی تھی واں
لگا اس سے کم کم تھا آب رواں

پہاڑی کہ تودا کہوں خاک کا
کہ انبار تھا خاروخاشاک کا

محاذی تھا اس کوہ کے ایک دشت
کہ دشوار تھا اس میں آدم کا گشت

ہوا بد بہت اور پانی لگے
قدم راہ چلتے ہوئے ڈگمگے

چلے باؤ تو ایک موحش ہے شور
رکھے پاؤں دامن کو کھینچے بزور

فقط خار بن کیا کپڑ پھاڑ تھا
کہ بوٹا بھی واں جھاڑ جھنکاڑ تھا

چلو ہی چلو ہے یہ چلتے نہیں
کہ اشجار آگے سے ملتے نہیں

نہ ٹوٹیں نہ سرکیں نہ کاٹے کٹیں
مگر پچھلے پاؤں ہی رہرو ہٹیں

کہیں ہاتھی آیا ہے بھڑکا ہے اونٹ
کھڑے لوگ پیتے ہیں لوہو کے گھونٹ

کہیں ہیں گے انفار سر گرم جنگ
کرے ٹٹو پر تل کا عرصہ ہے تنگ

قیامت نمودار ہر ہر قدم
چلے کوئی کیا رکھ کے سر پر قدم

کہیں بچ کے نکلے کہیں جھک چلے
کہیں مضطرب تھے کہیں رک چلے

اسی طور منزل کو کر قطع راہ
پہنچتے رہے ہم بحال تباہ

شجر جمع تھے کچھ نہ کوہ بھی
فرود آیا اس جا یہ انبوہ بھی

زمین اونچی نیچی خشونت بہت
اسی سے تھی واں کم سکونت بہت

ولیکن وہی خاک زشت و پلشت
ہوئی بود و آدم سے رشک بہشت

ہوئی بیلچوں سے برابر زمیں
چمن سے بھی شاداب وہ سرزمیں

وہ پانی جو چلتا نہ تھا ڈھنگ سے
کہ تھا رہگرا سر زناں سنگ سے

صفا اور خوبی میں کچھ بڑھ گیا
کئی ہات مقدار سے بڑھ گیا

غزل اس زمیں پر بھی کہنی ہے میر
دل اپنا ہے لطف سخن کا اسیر

غزل

وہ کمان ابرو اگر درپے ہوا ہے میر کے
ترکش ان پلکوں کا ہے بالائے ترکش تیر کے

یوں تو کہتا ہے گلے کا تو مرے تعویذ ہے
پر نہیں آثار ظاہر یار کی تسخیر کے

میں بھی زنجیری رہا ہوں دیر گلشن کے قریب
پہونچے ہونگے دور تک نالے مری زنجیر کے

خون ہی دستِ حنائی سے کیا کرتے ہو تم
لو کبھو ٹک ہاتھ میں دل کو کسو دلگیر کے

بندۂ صاحب میں نسبت ہے ولے نازک بہت
معترف رہتے ہیں عاشق اپنی ہی تقصیر کے

اور بھی وہ رشک خور کچھ اب خنک ملنے لگا
معتقد ہم کیا ہوں آہ صبح کی تاثیر کے

روئے دلکش وہ خدا جانے کہ کس سے کھنچ گیا
میر ہم عاشق رہے ہیں ایسی ہی تصویر کے

پہاڑی سے لشکر چلا سوے کوہ
چلے بس تو کریے سیہ روئے کوہ

پڑی وادی سوختہ بیچ میں
کہیں آب میں تھے کہیں کیچ میں

نیستان سے ہے خرابہ کڈھنگ
پٹیلے سے عرصہ نہایت ہے تنگ

شجر جنگل ایسے تھے انبوہ سے
کہ ان میں سے جانا ہو اندوہ سے

کہیں بید کے برگ خنجر گزار
کہیں پا نہ رکھنے دیں سر تیز خار

تنک دو درختوں کے اودھر ہوئے
نیستان پھرتے ہی پھرتے موئے

اگر بیدی آئے تو بن بید باف
نہ آئے نظر دور تک راہ صاف

اگر بانس تھے واں تو تھے دشت دشت
کہ دشوار تھا دو قدم کا بھی گشت

ہمیں چار نالے اترنے پڑے
کنارے پہ دو دو گھڑی تھے کھڑے

رہا ہر قدم گرنے ہی کا خطر
چلے دو قدم راہ پائی اگر

بہت لوگ دشت قلم کو گئے
بہت اسپ و اسپ و اشتر عدم کو گئے

لگے ہاتھ فیلان دشتی کی راہ   دے ڈر نہ ہو فیل کو سیاہ

نہ ہاتھی ملا کوئی بارے نہ شیر   ہوئی خیر گو طے ہوئی راہ دیر

شجر سر کشیدہ بہت کیا کہوں   جو دیکھوں تو پگڑی سنبھالے رہوں

چنار اُن درختوں کے تھے پائمال   سفیدار رکھتے تھے حکم نہال

اگر کوئی دریاچہ آتا ہے بیچ   تو لوگوں کے روندوں سے ہوتا ہے کیچ

تل کوہ رفعت نمودار ہو   گیا آمدوشد میں ہموار ہو

کہیں سبزۂ ترسے جی جا لگے   کہیں سرسوں پھولے دلوں کو ٹھگے

نہ تھا پر گل زرد دامانِ کوہ   یہی رنگ تھا تا گریبان کوہ

فضا دلکشا آب یکسر صفا   شجر خوشنما نرم نرمک ہوا

چکارے بہت مارے کہار میں   دورستہ بکا گوشت بازار میں

یہ انبوہ اشجار تاشش کروہ   پھر آگے بیاباں وہ ہے اور کور

کناروں میں اس کے کہیں کوئی کھیت   دگر نہ یہی سنگ بے رتبہ ریت

نہ سبزہ کہیں تھا نہ آبِ رواں   نہ دامن میں اس کے چکارا دواں

نہ کھائی نہ دیتا تھا خوش قد نہال   سیاہی پکڑتے تھے چشم غزال

وہی جنگلہ دوطرف بدنمود   مقام اسطرح کے بھی ہیں یاد بود

نہ پھولی تھی سرسوں نہ کچھ تھی بہار   نہ ظاہر میں اس کے کہیں لالہ زار

نہ چشمک زناں دورنزدیک پھول   نہ نرمی سے آتی تھی بادقبول

چلے باد ایسے کہ جھکڑ رہے   ہوا اور پانی میں پھکور ہے

اودھر باد کا شور ادھر آب کا   شب و روز مذکور کیا خواب کا

ادھر کے تئیں ایک تھا آبشار   وہ البتہ شایانِ سیر دشکار

وہیں ایک دم تھا دلوں کا لگاؤ   اُڑانے نہ دے جو حواسوں کو باؤ

سواپنے تئیں تو نہ تھا کچھ دماغ   کہ حال اپنا تھا جیسا بجھتا چراغ

بہت شعبۂ کوہ مشہور تھا   زبانوں پہ لوگوں کے مذکور تھا

قدم رکھ جونواب وہا تنگ گیا — سر اس شعبہ کا آسماں تک گیا
کڈھب وہ جگہ سیر گہ ہوگئی — حضور اُس کے فردوس تہ ہوگئی
ہوا خیمہ استادہ ایسی جگہ — کہ آنے لگی دیر داں سے تگہ
رواں دوطرف اس کے ایک آب کم — کہ دل کا لیے جائے سب زنگ غم
جہاں تک نظر کیجئے مدنظر — ہوا موج زن کوہ کے تا کمر
نظروالوں کے جی بھی ڈھلنے لگے — گرفتہ دل اس جائے کھلنے لگے
وہ پانی چلاواں سے دریا ہوا — رواں گرم تر سوئے صحرا ہوا
بہادامن کوہ میں سنگ پر — کیا سنگریزوں کو بھی رنگ پر
کہ لوگ اُن کو ہاتھوں میں رکھنے لگے — جواہر کے رنگوں پہ کھلنے لگے
کراڑوں کا کیا عظم کیجئے بیاں — برابر کھڑے تھے دو کوہ گراں
انہیں میں سے تھی راہ اس آب کی — وہیں بھیڑ رہتی تھی احباب کی
ہوئے دامن کوہ میں کچھ مقام — سفر کی بھی مدّت ہوشاید تمام
کوئی روز گھاٹی کی بھی سیر ہے — سبھوں کی ہے معلوم پھر خیر ہے
جو اس میں کسو سیر کا دیں نشاں — نظر آئے یاکوئی پیل وماں
تو اور ایک دودن کی ہوتی ہے دیر — وہ ہاتھی بندھے کہئے گایا وہ شیر
شکار ایسا دیکھا ہے اس بار کا — کہ جھاڑا ہوا دشت وکہسار کا
کوئی دیکھے کب تک پہاڑ اور جھاڑ — ٹلے چھاتی پر سے کہیں یہ پہاڑ
غرض ہے وزیر جہاں ارجمند — رئیس کلاں کار عالم پسند
در اس کا ہے باب سجود سراں — رہیں حکم کش اُسکے زور آوراں
سدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار — جہاں میں سخن ہے مرا یادگار
بہانے نہ کر میراب شاخ شاخ — غزل کہہ زمیں گوکہ ہے سنگلاخ

غزل

نہیں خوں بستگی سے چشم تر بند   جراحت نے کیے ہیں چشم پر بند

گیا ہے وہ سودل کھلتا نہیں ہے   پڑا ہے ایک مدت سے یہ گھر بند

کریں ہیں شوق گل خوں دل میں ناچار   اسیران شکستہ بال و پر بند

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے   اب آنکھیں رہتی ہیں دودوپہر بند

بہت ہے یار کا کم بولنا بھی   نہیں چنداں ہم ان باتوں کے در بند

سبھوں سے آرسی کے مثل واہو   کسو کے منھ پہ دروازہ نہ کر بند

ہمارے ہاتھ خنجر سے کرد قطع   نہ کھلوایا کبھو اُسکا کمر بند

رکے ہے یار آنکھیں ہی دکھا کر   ہم اس کے ان دنوں میں ہیں نظر بند

نہ خط آتا ہے اودھر سے نہ قاصد   لکھوں کیا مدتوں سے ہے خبر بند

غزل کا قافیہ تغیر کر میر

ہنر کچھ اس زمیں میں میر کر بند

جگرخوں کن ہیں خوبانِ حنا بند   دل ان کے دست رنگیں کا ہے پابند

گرہ بند قبا میں دلے ہمیں دیکھ   ہوا کیا آہ باغ دلکشا بند

رکھ آہ سردہی سے گرم جوشی   رکے ہے دل جو ہوتی ہے ہوا بند

ہمیں سے کیا وہ جادو گر نہ بولے   کسو دشمن نے اس کا منھ کیا بند

نہیں تھمتا ہے اب پلکوں سے رونا   بہت خاشاک سے دریا رہا بند

ہمیں منظور ہر صورت میں ہے دید   کھلی ہو چشم جوں آئینہ یا بند

نہیں کام آتی اتنی تیز گامی   سمند عمر ہوتا کاش جابند

زبردستوں کی کشتی ہوگئی پاک   نکالا عشق زور آور نے کیا بند

یہی انداز باندھے ہیں یہی ناز

قیامت میر صاحب ہیں ادا بند

شکارنامۂ دوم

مکرر ہے نواب کو قصد صید ۔۔۔ بیابان پہناور اب ہوگئے قید
رواں بحر لشکر ہوا موج موج ۔۔۔ گئی چشم خورشید تک گرد فوج
بحارد صحاری پہ ہے عرصہ تنگ ۔۔۔ مگریاں سراسیمہ ہیں واں پلنگ
پہن بیٹھے ہیں شیر بیری لباس ۔۔۔ کریں لوگ شاید فقیری کا پاس
چکارے ہرن دونوں اندیشہ مند ۔۔۔ دلوں میں ہر اس کمان و کمند
کہیں گرگِ وادی کو فکر گریز ۔۔۔ نظر ایدھر اودھر کرے شیر تیز
کہیں امن ہو تو کہوں واں گئے ۔۔۔ نکل آکھروں سے پریشاں گئے
اسد کی نہ شیرانہ ہنکار ہے ۔۔۔ نہ گفتار کو تاب رفتار ہے
جہاں کے تہاں فکر میں ہیں کھڑے ۔۔۔ کہ دنگل سے جنگل میں کیا بن پڑے
ہوا دود باروت سے تیرہ رنگ ۔۔۔ صدائے تفنگ و صدائے تفنگ
وحوش دبیاباں کو وحشت غضب ۔۔۔ ہوا ہیں کھڑکتے ہی پتے کے سب
ہزاروں ہی بندوق ہر دم چلے ۔۔۔ ہواہی میں پنچھی پکھیرو جلے
گئے باوجو آسماں میں پلٹ ۔۔۔ کلنگوں کی صف باز نے دی الٹ
اُڑے ہاتھ دو چار جرے کہاں ۔۔۔ رہے مرغ آبی جہاں کے تہاں
پر تیر جس دم کشادہ ہوئے ۔۔۔ بڑے صید حد سے زیادہ ہوئے
بتوں میں مچی دھوم سی آ کے دھوم ۔۔۔ جہاں دیکھیے ہے قیامت ہجوم
کہیں ارنے مارے غضنفر کہیں ۔۔۔ کہیں ہاتھ نکلا ہے اژدر کہیں
پڑے مست ہاتھی جو تھے من چلے ۔۔۔ سُن اس شور کو چھوڑ کر بن چلے
نہ تیرہ ہے روز گوزناں دگور ۔۔۔ کہ شیروں کو بھی قشعریرہ ہے زور

لب آب جاکر جو کھیلے شکار　　اسدواں کے تھے کودک بے سوار
ہوئے قرقرے صید ہو ہو کے ڈھیر　　ہوا میں سے بھاگا عقاب دلیر
زغن ان بنوں میں نہ پائی گئی　　نہ تندار کی لاش اُٹھائی گئی
ہوا ہے یہی تو یہ ہوئی نہیں　　کہ ہو خاذ آکر سیہ یاں کہیں
جگر کیا پرزن ہواس بن میں زاغ　　یہ زہرہ نہیں رکھتے کوہی کلاغ
شتر مرغ سیمرغ ازبس ہراس　　نہیں آتے کوہ شمالی کے پاس
غزل کہہ کہ ہے میر لطف ہوا　　بیاباں خوش آیندہ و خوش فضا

غزل

سبزہ ہے آبجو ہے فصل بہار بھی ہے　　سرگرم جلوہ دیکھو پہلوں میں یار بھی ہے
یہ تو نہیں کہ ہم پر ہر دم ہے بید ماغی　　آنکھیں دکھاتے ہیں تو چتون میں پیار بھی ہے
کل ہمکنار ہوگا ہنس کر کبھو چمن میں　　پر کم بغل ہے بلبل اُسکو قرار بھی ہے
ہوں وعدہ گاہ میں تو پر میں ہی جانتا ہوں　　کچھ اضطراب بھی ہے کچھ انتظار بھی ہے
جوں موج ہم بغل ہوں نایاب اس گہر سے　　دریا کی سیر بھی ہے بوس وکنار بھی ہے
ہم جبریوں سے کیا ہو بیدست و پاو عاجز　　کہنے کو کہتے ہیں تو کچھ اختیار بھی ہے
کون اس بھبھو کے سا ہے دیکھو نہ تنک بھی تو وہ　　شمع و چراغ و شعلہ برق و شرار بھی ہے
جانا مسلم آیا اس خاکداں سے گو پھر　　مشکل گزار ہے رستہ گرد و غبار بھی ہے
دل تنگ میر کیوں ہے ہمرہ وزیر کے تو
دریا فضا ہوا ہے سیرو شکار بھی ہے

اُٹھا فوج میں سے یہ گردو غبار　　کہ منھ پر تھا خورشید آئینہ دار
فلک گہرے سے تھا دھواں سانمود　　سماں شب کا رکھتا تھا ملک شہود
زمیں تھی سوتھی فرش بالائے آب　　تحمل حل سے مطلق نہ رکھتی تھی تاب
نہ پھوچھو کہ لوگوں کا کیا حال تھا　　جو رکھے قدم واں تو بھونچال تھا

روندے لگے چلنے تیزی سے چال ہوا مذہب شیعیاں ماعتزال
کسی ڈھب سے جوں توں کے چلنا ہوا عجب مہلکے سے نکلنا ہوا
اتر لوگ دریا سے آگے گئے ہنر بران خونخوار بھاگے گئے
پلنگان مردم ورایسے ڈرے کہ جاتے ہیں کوہوں کے چھوڑے درے
بیاباں میں مرنا کہاں سر دھریں نہ لیں راہ بڑعرب کیا کریں

غزل میر یاں کہہ اگر ہو دماغ
رکے دل ہمارے بھی ہوں باغ باغ

غزل

تھی باد بھی آنے کی چمن میں نہ روا دار پر کیجئے کیا گل صبا بھی ہے ہوادار
شایستہ دیدن ہے مرے یار کی صحبت وہ صاحب ناخواہ ہے بندہ ہے وفادار
کیا خوب ہو کیا زشت ہو رو دیوے ہی سکو اس عرصہ میں آئینہ کو دیکھا ہے ہوا دار
کس طور سے یک رنگ ہوں یے عاشق و معشوق ہے گل کنے زر بلبل بے برگ ہے نادار

کیا بیکسی سے میر نے رحلت کی جہاں سے
رویا نہ کوئی اُس پہ نہ کوئی ہے عزادار

بنوں میں پھرا کرتے ہیں ہم تو دیر نہیں بولتے ڈر سے غرندہ شیر
رہے تھے جو فیلان مست آن کر گئے کجلی بن یاں سے ڈرمان کر
جوان میں سے آکر لڑا پھر دیا سوکٹھ بندتوں سے ہوا فیل پا
گریوے کہیں تھے بلند اور پست پھر اُڑتے تھے واں جیسے پیلان مست
بہی تیغ نواب اس طور سے بہے جدول تیز جس طور سے
بہت رہ گئے زیر شمشیر و تیر بہت آئے لشکر میں ہو کر اسیر
لدے ہاتھیوں پر جو ہو کر شکار ہوئیں بوجھ سے پشت فیلاں فگار
کئے گم جو گینڈے نے اپنے حواس کھڑا ہو رہا آکے بھینسوں کے پاس

کہ بھینس اُسکو بھی جان کر لشکری
چلے جائیں صرصر نمط سرسری

نہ چھوڑا ہے طیر ایک عصفور تک
نہ وحشی کپی اور لنگور تک

لگے جاکے شاہین وستور یوں
پڑے بکریوں میں کہن گرگ جیوں

کلنگ ایسے بازوں سے آئے ستوہ
کہ کابل سے آگے گئے صد کروہ

نہیں قوچ سرزن نہ ایل نہ رنگ
ہوئے قید یا صید کیا بیدرنگ

غضب کرگئے جرے نواب کے
اڑاکھا گئے خیل سرخاب کے

نہ لگ لگ نہ تیتر رہا دشت میں
نہ غمخوارک آیا نظر گشت میں

سبھوں میں جو تھے قاز وسارس سرس
ہوئے صیدیوں جن پہ آیا ترس

حواصل کو ہوتا اگر حوصلہ
تو گرتا نہ کھیتوں میں ہو وہ دلہ

کہیں سارے طاؤس مرتے گئے
ادھر لوگ افسوس کرتے گئے

کہیں جی اُٹھی تھی زمیں بعد مرگ
نہال اس کے خوش قد بسیار برگ

نہ بستی سے صحرا تلک سبز تھے
نظر جائے جس جاتلک سبز تھے

ہوا دلکش وہر طرف سبزہ زار
کہ سرسوں نے کی تھی قیامت بہار

کھڑے لوگ محو تماشا تھے واں
کہ کہنے لگی بلبل خوش زباں

کہ خاطر جنوں سے نہ رکھتے نچنت
خبر بھی ہے تم کو کہ آئی بسنت

یہ عہد جنوں ہے جنوں کیجیے
جگر کو غزل کہتے خوں کیجیے

غزل

بلبل کے بولنے سے آزاروں نے پایا
کیا کہہ گئی کہ ہم کو سنتے ہی غش سا آیا

نخچیر گہہ میں اُس کے جاتا نہیں ہے کوئی
ہم کو تو شوق مفرط واں کا لگا کے لایا

انواع رنج ہم نے کھینچے تھے عاشقی میں
پر ہجر کے الم نے چنگا بہت بنایا

صوفی صاف مشرب بیہوش وبخیر و ہیں
مستی نے اس نگہہ کی مجلس کے تئیں چھکایا

مہر و وفا و الفت کرتے تھے لوگ باہم
رحمت خدا کی تم نے اس رسم کو اٹھایا

سر مارے تو پری کو ایسی روش نہ آئے — کس ناز سے زمیں پر پڑتا ہے اس کا سایا
یہ جانتا تو ہر گز بازار میں نہ جاتا — یوسف کے طور میں بھی سستا بہت بکایا
غیرت سے عاشقی کے جاتا نہیں ہوں میں تو — وہ خود بخود ہی آوے کاش اس طرف خدایا

معشوق تو بے پردہ اوباش کجروش ہے
کیا کہیئے میر جی سے دل کو کہاں لگایا

کسو ایسے جنگل میں جانا ہوا — کہ مشکل قدم کا اٹھانا ہوا
نظر گرد لشکر پہ تھی دمبدم — نہ تھا واں کے ضیغم کو کچھ اور غم
کوئی ارسلاں بھیجتا اگر رسول — تو شاید کہ الحاح ہوتی قبول
سودے خوں گرفتہ تو بھولے ہوئے — بہت اپنے زوروں پہ پھولے ہوئے
چلے ہر طرف اب جو آکر تفنگ — نہ اوقات صلح و نہ ہنگام جنگ
لگی آگ جنگل میں چار آگیا — بن آئی نہ کچھ مفت مار آگیا
ہوا چہرہ کوئی تو جوں شیر سنگ — نہ شیری دلیری نہ چہرے پہ رنگ
لگی گولی پڑنے نہ پھر چل سکا — نہ جا گہہ سے اُکسا نہ ٹک ہل سکا
چلے ہم جو بہڑاچ سے پیشتر — ہوئے صید دریا کے واں بیشتر
بھرے فرط ہی سے تو دیہات شہر — کہے تو کہ سوتے رہے رود و نہر
گھٹے گولیوں سے مگر بے شمار — رہے سوس گھڑیال چندیں ہزار
جو کچھ زخم پانی میں لے کر گئے — وہیں ہو کے ناسور مر مر گئے
لگا کہنے باخہ سر اپنا جھکا — کہ پانی تو جالوں سے سارا رُکا
اگر جایئے تہ کو دھس جایئے — دگر گاڑیئے سر تو پھنس جایئے
عجب مخمصہ ہے بچے کیونکہ جان — یہی موت ہے سوجھتی ہے ندان
جواب اس کا گھڑیال نے یوں دیا — گھڑی ایک دو کا ہے قصہ رہا
پڑی سر پہ بجتی ہے فرصت نہیں — پہر اُسکو کھینچتے ہیں اب کیا کہیں
تحمل ہو کچھ بھی تو تدبیر ہو — کریں کیا اگر یونہیں تقدیر ہو

کوئی دشت یکدست نے زار تھا　　رکھے واں قدم پاؤں افگار تھا
یہی سینک پاکانس پانی کی گھاس　　زمین وہوا آب وآتش اُداس
کہیں دوں لگی ہے تمامی ہے دود　　کہیں دوشجر ہیں سو کیا بد نمود
نہ پتا نہ شاخیں نہ کچھ اُن کو بار　　سراپا ہے خشک وزبوں زردوزار
نہ سائے سے ان کے کوئی بہرہ مند　　نہ دیکھا چرندہ نہ آیا پرند
سیاہی نہ ہرنوں کی ڈاروں نے کی　　نہ چشمک کہیں سے چکاروں نے کی
کہیں لپٹے آپس میں دوچار نے　　کہیں ہاتھی آیا کہیں شیر نے
کہیں سرپتا سر پہ تھا جیسے تیغ　　روندوں کے پاؤں پہ آیا دریغ
نہ بلبل غزلخواں نہ طیروں کا شور　　سبھی دیکھتے میر کے منھ کی اور
سواُن نے غزل ست سی یہ کہی　　دلے دل کو لوگ کے لگتی رہی

غزل

ذوق شکار اس کو ہے اتنا کہ حد نہیں　　کس اکی تیغ کش پہ ملک کو حسد نہیں
خالی پڑے ہیں صید سے وادی وکوہسار　　رہنے دو وحش وطیر کو اب دام ادو نہیں
بے جدوکد جواس سے ملاقات ہوتو ہو　　تم کد سے دیکھو ہو کہ ہمیں اس کی کد نہیں
کچھ اور شئے ہے خوب جو دیکھو رخ نگار　　ہر چند گل بھی تازہ کھلا اتنا بد نہیں
اس بیکسی سے کون جہاں میں موا کہ میں　　جز داغ سینہ آج چراغ لحد نہیں
کیا سروگل سے ہووے تسلی کہ اہل شوق　　گل مونہیں ہے یار کا سرد اسکا قد نہیں
بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا　　گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں
سوبار مست کعبے میں پکڑے گئے ہیں ہم　　رسوائی کے طریق کے کچھ نا بلد نہیں

لطف سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر
اب شعر ہم پڑھیں ہیں تو وہ شدومد نہیں

کسو ایسے بن سے نکلنا ہوا   کہ کوسوں تلک اس میں چلنا ہوا
کشیدہ قد اس بن کے سارے درخت   چمن کے سے نوبادگاں سبز بخت
برابر برابر کھڑے سربسر   پھرے دیر اودھر کو جاکر نظر
پڑے چل کہ آیا تراکم بہت   حواس اس میں جاکر ہوئے گم بہت
کہیں راہ نکلی تو چلتے پڑے   رہے پال وپرتل بہت واں کھڑے
کہ شاخوں نے جھک جھک ملائے تھے سر   بہت آگے جاجا کے آئے تھے پھر
وہی راہ در پیش وکثرت ہوئی   قیامت کے اوپر قیامت ہوئی
سروں پر اودھر توپ آئی چلی   پڑی تو اودھر لوگوں میں کھلبلی
کہیں اسپ واشتر کہیں فیل مست   زمیں ہر سرگام بالاؤ پست
گزر جس طرح اس طرح سے کیا   روندوں نے خونِ جگر ہی پیا
وہیں بیچ آیا میانا مرا   کوئی دیکھتا رنج اٹھانا مرا
سواری سے مجھ کو ندامت ہوئی   کہ چاروں طرف سے ملامت ہوئی
لگے کہنے آیا فرنگی کہاں   کہ چوپائی کی رسم چھوڑے ہے یاں
جسے دیکھو چار اُن نے رکھ کر کہار   لگا ہونے ہر صبح اسپر سوار
چلو ہی چلو ہے کہ بچ جائیو   کہ چوپالے کے پاس تم آئیو
روندے اودھر کے ادھر ہیں خراب   یہ جاتے ہیں مجرے کو بھاگے شتاب
چڑھے چار کے کاندھے جیتے ہی جی   لیا انکل اس سودے میں نفع بھی
کہ گھوڑے دیے چھوڑ یکبار گی   میانوں میں کرتے ہیں آوارگی
نہ اس حال سے اہل دفتر خبر   تو جہ نہ عمدوں کی کچھ ہے ادھر
دگرنہ ہو قدغن کہ اب اہل کار   نہ رہنے دیں لشکر میں ڈولی سوار
نہ مانیں تو چوپالے دیویں اُلٹ   ابھی گھوڑے لیں ڈپٹیں ایک ہی ڈپٹ
کرو میر بجز اور اب اختیار   مگر اس سے نکلیں دُر آب دار

جو جو ظلم کئے ہیں تم نے سو سو ہم نے اُٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں

تیغ دریغ نہیں ہے اُس کی بسمل گہہ میں کسو سے بھی
ہیں تو شکار لاغر ہم پر ایک اُمید پر آئے ہیں

ٹلکر سامنے یوں بھی اب جو تیر ترازو ہو اُس کا
کیا کیا لو ہوپی کردل کو اس پلے پر لائے ہیں

خم سے لگی میخانہ کے دیوار بھی اپنے گھر کی ہے
لطف پیر مغاں سے عجب کیا ہم آخر ہمسائے ہیں

شوق ہے غم میں بے صبری ہے آہ کسو کو کیا کہئے
اچھے اپنے جی کو ہمنے آپ ہی روگ لگائے ہیں

محو سخن ہم فکر سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں
آپ کو جب کھویا ہے ہم نے تب یہ گوہر پائے ہیں

دیکھیں طرف ہے کون سی جس سے تیغ ناز بلند کرے
ہم نے بھی تو اس ہی جہت سے فرق نیاز جھکائے ہیں

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

کسکو ایسی بیخبری تھی جس کے بولے تو چونکا
سوٹھوکر نے ان پلکوں کی کتنے فتنے جگائے ہیں

کون وہ ایسا ظالم تھا اُستاد فن عیاری کا
اتنے سن میں جن نے تجھ کو ایسے فریب سکھائے ہیں

میر مقدس آدمی ہیں تھے سبحہ بکف میخانے میں
صبح جو ہم بھی جانکلے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

کیا ایک نالے سے ہم نے گزر   ہوئی قائم اس جاپہ حشر دگر
گرے گاڑی چھکڑے پیادے سوار   کہ مقصد تھا سب کا عبور ایک بار

گزارا جو فیلوں کا پہلا ہوا   ملا خاک میں آب چہلا ہوا
کمر تک لگے پھنسنے دلدل کے بیچ   کہ نالے کا پانی تھا یکدست کیچ
پھنسے گاؤ اشتر گرے بارخر   ہوئے اسپ واشتر بھی زیر وزبر
اگر چند باندھے تھے وہ جسر خام   ہوئے ایک ریلے میں دونوں تمام
نہ دیکھے تھے آگے کبھو یہ سمیں   ولیکن خدانے اتارا ہمیں
چلے واں سے آگے بنڈیلا ملا   کیا اُن نے ایک ایک کو وہ دلا
عجب راہ پر خوف مشکل گزار   نہ ہوتے تھے معلوم ہاتھی سوار
خطر شیر کا شور بنگاہ کا   تعب واں کے جانے کا غم راہ کا
کہ جاؤ زمیں کچھ ہویدا نہ تھی   کہیں اس میں پگڈنڈی پیدا نہ تھی
صدابرگ نے کی نہایت مہیب   طریق عجب ومسافر غریب
جنوں پیشہ وہ دشت وخشت شعار   کہ فیل اُس کے طفلان بازی مدار
کہیں پانی آیا سوحالت خراب   کہ تھا زیر کاہ اس میں ہر جائے آب
نہ ہاتھی نہ اسباب اپنے کنے   یہی اک میانہ بنے سوبنے
چنانچہ گئے راوتی کے کنار   نہ ربط آشنائی کسو سے نہ پیار
کھڑے ہم رہے ہاتھ پر رکھکے ہاتھ   کریں پار جانے کی کس منھ سے بات
کہار اک میانے میں اپنے دیئے   پھر اُسکے جو تھے چاروں ہمنے لیے
چڑھ اُن کے سر آنروئے دریا ہوئے   ہوئے پانی پانی کہ رسوا ہوئے
نہ جانا کہ آتا ہے کس کا قدم   کہ صید بیاباں گئے کرکے رم
گوزن ایک دومار لائے کبھو   اڑے باز جرے کہیں ایک سو

نہ صید ایک دیکھا بھرے لاکھ رنگ
غزل میرنے بھی کہی اور ڈھنگ

غزل

یک درج موتیوں کے عوض ہاتھ آگیا　یوسف ہزار حیف کہ سستا بکا گیا
جانا نہ تھا سرھانے سے مجھ محتضر کے ہائے　کیا وقت رہ گیا تھا کہ وہ منھ چھپا گیا
آشفتہ سر ہیں سرو گریباں دریدہ گل　بیٹھا کہاں چمن میں کہ فتنہ اٹھا گیا
گلبرگ سے بھرے تھے کبھو تو کنار و جیب　کیا کیا کمیں نہ گریۂ خونیں دکھا گیا
خط بھیج کے بھی شوق کی باتیں چلی گئیں　قاصد کے پیچھے دور تلک میں لگا گیا
روتا ہوں یوں کہ برسے ہے شدت سے جیسے منھ　جوں ابر میرے دل پہ غم عشق چھا گیا
جو نقش روزگار کے صفحے سے محو ہو　صورت پذیر پھر نہیں ہوتا مٹا گیا
ہستی مری کہ، ہیچ تھی میں منفعل رہا　اس شرم سے ندان زمیں میں سما گیا

داغ دل خراب شبوں کو جلے ہے میر
عشق اس خرابے میں بھی چراغ اک جلا گیا

چلے صبح گہہ دامنِ کوہ کو　تماشا کناں فوج و انبوہ کو
درختوں میں چلنا تو دشوار تھا　وے راستہ بھی قدم وار تھا
گزارا ہوایوں ہی اک آدھ کوس　پٹیلے پہ ہنگامہ آراتھی اوس
نیستاں میں چھپتا تھا گھوڑے سوار　اگر ہو تو واں شیر کا ہوشکار
پٹیلے سے کیلے کا جنگل ملا　پھر آکرو ہیں یہ جو دنگل ملا
عجب کشمکش درمیاں آگئی　بھیڑ اک بلا تھی جہاں آگئی
نہ ہلنے کی جاگہ نہ چلنے کو راہ　سروں پر کھڑے اسپ و فیل سپاہ
خطر فیلدشتی کا ہر ہر قدم　گئے شعیر کے ہر قدم پر قدم
سر کوہ کیونکر نہ ہو چرخ سائے　کہ نواب داں سیر کرنے کو جائے
رہے آب پر فرش چوکی و تخت　خجے رود کوہ وزہے ان کے بخت
ہمارا تو جانے کو چاہا نہ جی　کہ تھے پیر ہم واں ہوا خوب تھی
رہی منعقد بزم تھا ناچ راگ　نہ ہو کچھ تو کیونکر ہو یہ دلگی لاگ

کہی اور ہی بحر میں یہ غزل
مگر میر کو ہے دماغی خلل

غزل

کر لطف عارض مت چھپا عاشق سے اے یار اس قدر
یک جان کو یہ عارضے یک دل کو افکار اس قدر

جو کچھ ہے سو دل کے سبب غم غصہ و رنج و تعب
تجھے چاہنے سے پیشتر کا ہے کو بیمار اس قدر

ہر دم جو اس کے ابرواں جنبش میں ہیں کانپے ہے جاں
یعنی ہیں آنکھیں جھپتیاں چلتی ہے تلوار اس قدر

شب نالۂ وزاری رہے دن خستگی خواری رہے
وہ دل نہیں باقی رہا کھینچے جو آزار اس قدر

دے دل زدے ہیں خستہ جاں مرجاتے ہیں جو نا گہاں
ورنہ قضا کس شخص کی پہونچی ہے یکبار اس قدر

طرے سے طراری کرے مستی میں ہشیاری کرے
آیا نظر اب تک نہیں طرار و عیار اس قدر

الفت کہاں کلفت ہے یاں یہ بھی عجب صحبت ہے میاں
بیزار وہ اس مرتبہ جس سے ہمیں پیار اس قدر

تم آگے کب تھے بدگماں سب جحت و یکسر زباں
اب اک سخن پر مہرباں کرتے ہو تکرار اس قدر

آنکھیں کھلی ہیں میر کی جب دیکھو تب آئینہ ساں
آدم نہیں ہوتے کہیں مشتاق دیدار اس قدر

بہا سنگ ریزوں پہ اس رنگ آب — کہ قدر اُن کی جوں قدر یاقوت ناب
لیے عمدے ہاتھوں میں دیکھیں بہار — کہ ہر شے کا ہے وقت لیل و نہار

اسی آب کا رابق یاں ہے نام ہمیں ساتھ اس کے ہے ربط تمام

کنارے کنارے اسی کے ہے راہ چلے جاتے ہیں جو نہ ہووے پناہ

جہاں تک ہے آب وخورااب جائینگے ہمیں دیکھیں گے جو نظر آئیں گے

جبل سے ہوئے ظاہر آثار آب برسنے لگا قطرہ قطرہ سحاب

ہمیں پر نہیں کچھ ہوا کا ستم کہیں گرگِ وادی کو بھی ہے یہ غم

کہیں ایسے سکڑے ہیں حیوان دشت کہ ٹکڑے کرو تو نہوں گرم گشت

اسد یکطرف یوز یکسور ہے عجب یہ ہے باندھے گئے اژدہے

نہ پوچھو کھنچا دور کار شکار نہ اب دشت دور میں نمر ہے نہ مار

شکار افکناں راہ کرتے تھے طے ملے جاتے تھے خاک میں دشت نے

بیروں کو جنگل میں طاقت رہی نہ مگروں کو پانی میں فرصت رہی

اسد مارے جاتے تھے سگ کی مثال بندھے آتے تھے یوزوگرگ و غزال

ملا ایک چقر اگر یا گڑھا تو کثرت سے تو نیزہ پانی چڑھا

بہت مشکلوں سے کیا ہے عبور کہ یک گام راہ اور سو سو فتور

غزل بحر کامل میں تہہ دار کہہ

کہ اُڑ جائے میر اس بجیرے کی تہ

غزل

نہ دماغ ہے کہ کسو سے ہم کریں گفتگو غم یار میں

نہ فراغ ہے کہ فقیروں سے ملیں جا کے دلّی دیار میں

نہ چمن میں جاتے رہا ہے دل نہ بنوں میں پھرنے لگا ہے دل

وہی بیکلی رہی جان کو رہے سیر میں نہ شکار میں

کہے کون صیدِ رمیدہ سے کہ ادھر بھی پھر کے نظر کرے

کہ نقاب اُلٹے سوار ہے ترے پیچھے کوئی غبار میں

ترے شام خط کے قریب کی جو صفا میں دیکھی میں خوبیاں
نہ کمیں پہ گل میں نظر پڑے نہ یہ رنگ صبح بہار میں

کوئی شعلہ ہے کہ شرارہ ہے کہ ہوا ہے یہ کہ ستارا ہے
یہی دل جو لے کے گڑینگے ہم تو لگے گی آگ مزار میں

جھگی کچھ کہ جی میں چھبی کبھی ہلی ٹک کہ دل میں کبھی کبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اس کے ہے نہ چھری میں ہی نہ کٹار میں

مرے ایک دل میں جو غم یہ ہے سو فزون ہے میرے شمار سے
نہ تو دس میں یہ نہ پچاس میں نہ تو سو میں یہ نہ ہزار میں

بڑے جانور خوار کیا کیا ہوئے
بندھے پائے فیلاں سے رسوا ہوئے

بہت تالے کھولے پکھالے گئے
بحیروں سے روہو نکالے گئے

نگر کی پس از مرگ نفرت ہوئی
کہ ہاتھی پہ چڑھنے کی رخصت ہوئی

کشف کا ہوا ہے یہ اوصاف اب
کہ جھینگوں نے کی شرح کشاف اب

نہ تیتر بٹیر اور کبو ترملا
دیے باز جروں کو سازے کھلا

کہیں بحری پانی میں یوں جالگے
کہ پنجوں میں بے صید ادھر آ لگے

ہوا میں سے یوں گرا تارے کلنگ
کہ باڑوں نے چڑیا سے مارے کلنگ

کسواور ارنوں کو دیکھا کھڑے
کہے تو بیاباں میں ہاتھی پڑے

جگر کر کے جاتے تھے مردان کار
تو وہ ایک دو کر ہی لاتے شکار

وگرنہ بشر کا نہ مقدور تھا
قریب اس کے جانا بہت دور تھا

نہ ان چار شانوں کا روکش ہے شیر
نہ سو فیل دو چار رکھتے ہیں گھیر

مدد گار تھے حضرت زندہ فیل
پکڑ لاتے تھے لوگ تب زندہ فیل

بحیرہ نہ دریائے اعظم سے کم
اٹھا کرتے تھے لچے لطمے بہم

ہر اک موج اس کی سمندر کی لہر
کنارے پہ گرداب غرقاب قہر

یہی جنگل اس جھیل کے آس پاس
درختوں کا انبوہ نے کا اگاس

اسی بن میں شیر اور یوز و پلنگ | اسی بن میں گورو گوزن اور رنگ
اسی بن میں ہاتھی وہیں کرگدن | وہیں قوچ سرزن اسی میں ہرن
اسی بن میں لنگور بندر بھی تھے | وہیں ایک دو ہم قلندر بھی تھے
اسی بن میں پاڑھا وہیں نیل گاؤ | اسی بن میں یہ صید بندی کا چاؤ
اسی بن میں تھے حضرت بوجمید | اسی بن میں نسناسی اُن کے مرید
اسی بن میں تھے خوک جاموش رنگ | کیا اس سور بن نے لوگوں کو تنگ
اسی بن میں رہنا اس بن میں راہ | وہیں شام کا حسن لطف پگاہ
اسی بن میں وہ جھیل گہری بہت | ہوئے صید بری و بحری بہت
وہیں مچھلی بکتی تھی دمڑی کی سیر | ولیکن نہ کھاتا تھا ہو کوئی سیر
کہ اس آب کا ہضم دشوار تھا | کہ جوں آب شمشیر دم دار تھا
شغال اور خرگوش جی سے گئے | شکاری سگ اُن کو اچک لےگئے

غزل سے لگا ہے بہت میر دل
کہ اس مثنوی میں کہیں متصل

غزل

ہے گئی طلب شرط یاں کچھ تو کیا چاہیے | بیٹھے نیں بنتی میاں کچھ تو کیا چاہیے
عشق میں اے ہمرہاں کچھ تو کیا چاہیے | گریہ دشور وفغاں کچھ تو کیا چاہیے
ہاتھ رکھے ہاتھ پر بیٹھے ہو کیا بیخبر | چلنے کو ہے کارواں کچھ تو کیا چاہیے
میں جو کہاں تنگ ہوں مار مروں کیا کروں | وہ بھی لگا کہنے ہاں کچھ تو کیا چاہیے
سون کسے رہنے کی کس نے بدی ہے بھلا | لطف و غضب مہرباں کچھ تو کیا چاہیے
کام اب اپنا ہے یاں کندن جاں ہر زماں | کیا کریں ہم ناتواں کچھ تو کیا چاہیے
کیا کروں دل خوں کروں شعر ہی موزوں کروں | چلتی ہے ابتک زباں کچھ تو کیا چاہیے
ہو نہ سکے گر نماز دل کی طرف کر نیاز | وقت گیا پھر کہاں کچھ تو کیا چاہیے

چاہوں کسو سے دعا دل کی کروں اب دوا — نفع ہو پھر یا زیاں کچھ تو کیا چاہیے

عمر گئی لغو سب وقت بہت کم ہے اب — کچھ نہ کیا ہائے میاں کچھ تو کیا چاہیے

یہ تو نہیں دوستی ہم سے جو تم کو رہی — پاس دلِ دوستاں کچھ تو کیا چاہیے

تو نے کماں کی ہے زہ پر ہوں یوں صید میں — میری بھی خاطر نشاں کچھ تو کیا چاہیے

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے
نام خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیے

کنارے پہ تھی اسکے اک گل زمیں — سراسر ہری جوں زمرد نگیں

جہاں تک نظر جائے شاداب تھی — کہ یکدست واقع لب آب تھی

وہیں خیمے سب کے ہوئے تھے کھڑے — وہیں دام رہتے تھے اکثر پڑے

نواڑوں کی سیر اس میں ہر شام گہہ — وہی سیر گاہ دوہی دام گہہ

وہیں صید ہوں مرغ وماہی تمام — مقام ایسے ہو دیں تو کریے مقام

وہیں صید ہوں مرغ وماہی تمام — مقام ایسے ہو دیں تو کریے مقام

ہوا خیمہ آکر جو نواب کا — فلک سائے تھا فرق اس آب کا

ہوا ہوتا واں کاش دوآب رز — ہوئے جیسے شایستہ سیر نز

عجب ڈھب سے کی روشنی صد عجب — کہ دیں چھوڑنا دین دیے بھر کے سب

جدا ہو وہیں تو غنچہ غنچہ چراغ — ملے جیسے عاشق کی چھاتی کے داغ

درے روشنی شعلہ انگریز نار — پرے سطح پانی کا آئینہ دار

ہوئیں کشتیاں کچھ درے سے پرے — چراغوں سے موجوں کے کوچے بھرے

حبابوں میں تھی جو چراغوں کی تاب — حبابی تھا آئینہ سب سطح آب

نمودار چرخ پر انجم تھی شب — دلوں سے وہ پھیلاؤ پانی کا سب

غرض روشنی کی عجب کچھ تھی لاگ — لگادی ہے گویا کہ پانی میں آگ

غزل میر کوئی کہا چاہیے
کسو تو زمیں پر رہا چاہیے

غزل

کب آوے گا کیا جانے وہ سروقامت　　ہمارے تو سر پر ابھی ہے قیامت
نماز سفر ہے اشارت اسی سے　　کہ تھوڑا بہت یاں ہے وقت اقامت
رہا رابطہ غارت دل تلک بس　　نہیں اب تو بندے سے صاحب سلامت
اٹھا کر نہ یک زخم شمشیر اُس کا　　غزالِ حرم نے اٹھائی ملامت
بگڑتی ہے صورت علاقے سے دل کے　　کسو بیوفا سے دل اپنا لگا مت
کوئی فصل گل میں بھی توبہ کرے ہے　　رہے گی ہمیں دیر اس کی ندامت
کہیں دل کی لاگیں لگی چھپتیاں ہیں　　کہ چہرے کی زردی بڑی ہے علامت
گئی سو گئی پیشتر تھی جوانی
رہ عشق میں میر آئندہ جامت

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ　　امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہ نامے کی فکر　　کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
گیا شہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم　　دل شاعراں رشک سے ہے دونیم
کنھوں نے کہی عشق کی داستاں　　ہوا کوئی کھانے سے ہم داستاں
پئے آصف الدّولہ میں نے بھی میر　　کہے صید نامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ مشہور ہو　　گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو
زہے آصف الدولہ داد گر　　سخنور نواز اور عاشق ہنر
دہش سے جہاں اُسکے رونق پذیر　　وزیر ابن دستور ابن وزیر
کریمی کرے تو جہاں در جہاں　　کف جود خورشید سازرفشاں
سراپائے احساں تمامی همم　　ہمہ تن مروت سرا سر کرم
ہمیشہ رہے گرم سیرو شکار　　یہ حرف و حکایت بھی ہے یاد گار

قفائے غزل اک رباعی کہو سخن آگے موقوف چپکے رہو
بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاع ہنر پھیر لیکر چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

غزل

کروتامل کہ ہم میں رہا نہیں ہے غموں کے مارے
جو کچھ بھروسہ جنہوں پہ تھا سو شکیب و تاب تواں سدھارے

ہوئے ہیں غائر قیامت اب تو گئے جگر تک گئے ہیں دل تک
جو ٹک بھی دیکھے وہ غور سے تو جراحت اسکو دکھائیں سارے

ہماری آنکھیں بہیں ہیں اتنی کہ اب ہے دریا محیط عالم
کہیں کہیں جو رہیں ہیں مردم سو بیٹھے ہیں وے کیے کنارے

کریں تحمل سو کا ہے پر ہم مدام بیخود ہمیشہ غش ہے
گئی ہے طاقت دلوں سے شاید نہیں ہے آیا جگر ہمارے

کبھو سروں پر ہے تیغ نالہ کبھو سنانِ فغاں جگر پر
کسو سے کہنے کا کچھ بھی حاصل گئے ہیں جوں توں کے وقت بارے

بھری تھی آتش کہاں کی یارب دل و جگر میں کہ نصف شبکو
لگا جو رونے تو جائے آنسو مری مژہ سے گرے شرارے

قبول عشقِ ومحبت اتنا ہوا ہے اے میر سیر قاتل
مدام جاتے دکھائی دوں ہوں کبھو نہ اُن نے کہا کہ آرے

رباعی

چلنے کو ہوئے بادیے سے ہم جو کڑے — مل چلنے کے اتفاق بھیرے پڑے
مجنوں نے کہا تھا میں بھی آتا ہوں میر — آیا نہ رہے راہ میں ہم دیر کھڑے

☆☆☆

مثنوی ساقی نامہ

ہے قابل حمد وہ سرانداز — جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز
اُسکو ہے حسن نے چھکایا — ہستی کا نشہ اسی سے پایا
پی اُن نے شراب خود پرستی — طاری ہوئی اُس پہ زور مستی
وہ مست شراب ناز ہے فرد — خورشید ہے اُس کا جام پردرد
ہے گردش چشم اس سے افسوں — پھر جائے ہے جس کے ساتھ گردوں
ظلمت ہے دوئی کی تجھ سے احول — آخر ہے وہی وہی ہے اول
عالم ہے قرابۂ مئے فام — ہے دورِ سپہر گردش جام
مشہور جہاں جو کیف و کم ہے — بے نشہ جو ہووے تو ستم ہے
وہ مست نیاز ہے حرم میں — وہ رفتہ ناز ہے صنم میں
ہے اب رخ زمانہ اُس سے — روشن ہے تمام خانہ اُس سے
مینا میں جو سرکشی ہے وہ ہے — صہبا میں جو دل خوشی ہے وہ ہے
شمشاد ہے سرفراز اس سے — گل دیدۂ نیم باز اس سے
خوگر اسے ناز پیشگی ہے — وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے
جو عکس پڑا ہے جام مے میں — آتی ہے صدا اسی کی نے میں
ہے جلوہ گری میں یاں بصدناز — وہ مست گزارہ و سرانداز
سورنگ ہیں اس کے یادرکھ تو — ہر جلوہ سے دل کو شاد رکھ تو
عالم میں جو کچھ نمود میں ہے — ہر لحظ اُسے سجود میں ہے
کریاد اُسی کو اور مے پی — جیتا رہے کوئی دن تو خوش جی

اب روئے سخن چمن کو کریے　　مینائے دل اور مئے سے بھریے
آئی ہے بہار مے گساراں　　پھولے ہیں چمن میں گل ہزاراں
آئی ہے بہار و ہر خیاباں　　ہے لطف ہوا سے گل بداماں
آئی ہے بہار زہد کیشاں　　ہے تو بہ ٔ بادہ دل پریشاں
آئی ہے بہار مرغ گلزار　　کرتا ہے نوائے سینہ افگار
لایا ہے بزور اس کا نالہ　　مجھ کو بھی برائے سیر لالہ
ساقی جو کروں میں بے ادائی　　معذور رکھ اب بہار آئی
گل بادِ صبا کے تاکر ہے　　دامانِ بلند ابرتر ہے
غنچہ کی گلابیاں بھری ہیں　　تکلیف کی منتظر دھری ہیں
ظالم مئے ناب دے ہوا ہے　　اک جرعہ شراب دے ہوا ہے
ہر سر میں ہے شور فصل دے کا　　چمکے ہے ہوا سے رنگ مئے کا
اطراف چمن کھلا ہے لالہ　　ہر پھول شراب کا ہے پیالہ
آتا ہے چمن پہ ابر جوشاں　　آب رخ کار سبز پوشاں
تحریک نسیم ومبدم ہے　　تکلیف ہوائے گل ستم ہے
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی　　اُٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا　　رنگ گل ولالہ زور چمکا
ہے گل کی ہوا سبو کشی میں　　بلبل کا دماغ بوکشی میں
ہرشاخ ہے شوخ جام دردست　　نرگس ہے کسو کی نرگس مست
ہے رنگ ہوا کا آفتابی　　جھومیں ہیں نہال جو شرابی
ہے سروجوان نشہ درسر　　لوٹے ہے روش پہ سبزہ تر
چشمک کرے ہے حباب جوکا　　یعنی کہ ہے دوراب سبوکا

ساقی قدحے کہ ذوق مل ہے
مطرب غزلے کہ فصل گل ہے

غزل

شب وہ جو پیے شراب نکلا　　جانا یہ کہ آفتاب نکلا
قربان پیالۂ مئے ناب　　جس سے کہ ترا حجاب نکلا
تجھ بن جو پیا تھا قطرۂ مئے کا　　آنکھوں سے ہو خون ناب نکلا
مستی میں شراب کے جو دیکھا　　عالم یہ تمام خواب نکلا
شیخ آنے تو میکدے میں آیا　　پر ہو کے بہت خراب نکلا
یک جرعہ شراب ہی میں واعظہ　　ہر مسخر گی کا باب نکلا

تھا غیرت بادہ عکس گل سے
جس جوئے چمن سے آب نکلا

ہو صرف شراب کاش ساقی　　یہ شیشۂ عمر ہے جو باقی
بے ساغرے خنک ہے جینا　　رکھتا ہے شگوں شراب پینا
لابادۂ کہنہ سال تو ہے　　سجادہ بھی بابت گرد ہے
دروازۂ میکدہ کھلا ہے　　ہر پیر وجواں کو الصلا ہے
اینڈے ہے ہر ایک مست جوں تاک　　لیتے نہیں نام دامن پاک
ہر مغبچہ جام زیر سر ہے　　ہر گوشے میں عالم دگر ہے
مستی نگاہ عقل دشمن　　خوبی خرام مرد افگن
جو لوگ کہ اس جگہ سے اٹھے　　کب حلقہ و خانقہ سے اُٹھے
یاں پیتے ہیں جام بیخودی کا　　ہے دور تمام بیخودی کا
مستی سے ہر ایک صبح صدبار　　خورشید کا سر ہے اور دیوار
ہے قابل سیر خرقہ پوشاں　　دریا دلی شراب نوشاں
ان لوگوں کی ہر کمینہ صف میں　　کشتی ہے شہہ و گدا کی کف میں
ہر کوچہ میں رہتی تھی منادی　　تا رسم خردوری اٹھادی

ازخود شدن اک مقام ہیگا — وہ مرتبہ یاں مدام ہے گا
گو پر ہے یہ دور پر کہاں تک — اک لغزش پا ہے یاں سے واں تک
بیخود ہو کہ یہ حجاب اُٹھے — دل یاں سے کہیں شتاب اٹھے
پہونچیں ہیں فنا کو بیخودی سے — پاتے ہیں خدا کو بیخودی سے
پی جرعۂ و ہوش کو دعا کہہ — ہر بادہ فروش کودعا کہہ
جوشش میں ہے بادۂ کہن سال — عبرت ہو جسے خوش اسکا احوال
اب دل میں مرے بھی جوش آیا — اب وقت وداع ہوش آیا
کھینچوں میں کہاں تلک دمِ سرد — ساقی وہ شراب شعلہ پرورد
وہ داروے درد بے حضوراں — وہ مایۂ نورِ چشمِ کوراں
سرمایۂ عمرِ جاودانی — یعنے ہے وہ آب زندگانی
وہ میوۂ خوش رسیدہ بارے — وہ عیش دل گزیدہ بارے
آئینہ حسنِ خود پسنداں — زینت دہِ عنبریں کمنداں
وہ رنگ رخِ بہار یعنی — وہ بادۂ خوشگوار یعنی
یاقوت گداز دادۂ عشق — یعنی وہ ہے جام بادۂ عشق
وہ لطفِ ہوا وہ سیرِ مہتاب — وہ شعلۂ غوطہ خوردہ درآب
وہ کام دلِ سبو بدو شاں — یعنی کہ وہ ہے شراب جو شاں
وہ موجب دل خوشی کہاں ہے — وہ داروئے بے ہشی کہاں ہے
وہ جس کی طرف کو ہے تہ دل — یعنی وہ ہے ماہ شیشہ منزل
وہ آتش تیز آب آمیز — وہ عربدہ جو وہ فتنہ انگیز
وہ مقصدِ جان نا اُمیداں — وہ روسیہٴ روسفیداں
وہ رونق کارگاہ شیشہ — وہ شوکت بار گاہِ شیشہ
وہ جس سے ہے تو بہ مو پریشاں — وہ جس سے ہو گفتگو پریشاں
وہ دامنِ خشک جس سے جلجائے — ثابت قدموں کاپاؤں چل جائے
وہ سرخی چشم خوب رویاں — اسباب خرابی نکویاں

وہ جس سے غبارِ دل سے دھوؤں — مینا کے گلے سے لگ کے روؤں
مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں — اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں
لا اُس کو جو آستین جھاڑوں — پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں
بیہوش شراب ناب رہیے — یوں تابہ کجا کباب رہیئے
ہے مستی بیخودی ضروری — کھل جائے مقام بے شعوری
دل غم سے بھرا ہے زور میرا — تا عرش گیا ہے شور میرا
ہے دل میں کہ گل کی اور رو ہو — شیشہ ہو بغل میں اور تو ہو
ہر گام پہ لغزش قدم ہو — تکلیف شراب دمبدم ہو
جب سجدہ کناں ہوں صبح خیزاں — جب کاکل صبح ہو پریشاں
جب نکلے ستارۂ سحر گہہ — کر نعرۂ الصبوح یک رہ
ہے ذوقِ شراب صبح گاہی — بے لطف نہیں ہے روسیاہی
جب ہو دے نشہ ترنگ آوے — کر ایسی نگاہ جو چھکا وے
جب بیخودی تمام آوے — سر پر مرے ہوش روکے جاوے
رخصت ہے تجھے کہ میں نہ ہو نگا — بیہوش وخردہی پھر رہوں گا
بیٹھا تو کروں گا شکر تیرا — ہوورنہ قبول عذر میرا

مقولہ شاعر

کیا میر شراب تونے پی ہے — بیہودہ یہ گفتگو جو کی ہے
یا آبِ سیہ ترے قلم نے — یہ تجھ سے عجب کیا ہے ہم نے
تو کا ہے کو اتنا ہرزہ گوتھا — کب درگر د شراب تو تھا
بس مے سے زبان اب نہ تر کر — مستی سخن پہ ٹک نظر کر

ہے نشۂ سامعہ دوبالا
پھر حرف نہ جائے گا سنبھالا

مثنویات جذبات عشق

میر تقی میر دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی شعلۂ شوق

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور ۔ نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب ۔ محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبت بن اس جانہ آیا کوئی ۔ محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت ہی اس کار خانے میں ہے ۔ محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ ۔ محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ
محبت اگر کار پرواز ہو ۔ دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو
محبت ہے آبِ رخ کارِ دل ۔ محبت ہے گرمی آزار دل
محبت عجب خواب خونریز ہے ۔ محبت بلائے دل آویز ہے
محبت کی ہیں کار پر دازیاں ۔ کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل ۔ محبت نہ ہووے تو پتھر ہے دل
محبت کو ہے اس گلستاں میں راہ ۔ کلی کے دل تنگ میں بھی ہے چاہ
محبت ہی سے دل کو رو بیٹھے ۔ محبت میں جی مفت کھو بیٹھے
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ ۔ محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
محبت سے ہے انتظام جہاں ۔ محبت سے گردش میں ہی آسماں
محبت سے روتے گئے یار خوں ۔ محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں
محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو ۔ محبت سے ہو جو وہ ہر گز نہ ہو

محبت سے پروانہ آتش بجاں　　محبت سے بلبل ہے گرم فغاں
اسی آگ سے شمع کو ہے گداز　　اسی کے لیے گل ہے سرگرم ناز
محبت سے یاروں کے ہیں رنگ زرد　　دلوں میں محبت سے اٹھتے ہیں درد
گیا قیس ناشاد اس عشق میں　　کھپی جان فرہاد اس عشق میں
ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ　　کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ
جو عذرا پہ گزرا سو مشہور ہے　　دمن کا بھی احوال مذکور ہے
اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں　　یہی ذرے کی جان نومید میں
اسی سے دل ماہ ہے داغدار　　کتاں کا جگر ہے سراسر فگار
نئے اس کے چرچے حکایت سنی　　گہے شکر گا ہے شکایت سنی
اسی سے قیامت ہے ہر چار اور　　اسی فتنہ گر کا ہے عالم میں شور
کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں　　نہ ہو اس سے آشوب محشر عیاں
کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی　　کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی
زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار　　غرض ہے یہ اعجوبۂ روز گار

آغاز قصہ

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا　　عجب اہل عالم کو جس سے ہوا
کہ واں اک جواں تھا پر سرام نام　　خوش اندام وخوش قامت وخوش خرام
جوانی کے گلشن کا وہ آب ورنگ　　گلستاں پہ کام اُسکی خوبی سے تنگ
جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ　　چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ
کھلے بال چلتا تھا وہ سرو ناز　　قد مبوس کو آتی عمر دراز
جدھر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو　　قیامت اُدھر سے نمودار ہو
نگہہ گرم اُس کی جدھر جا لڑی　　کہے تو کہ اودھر کو بجلی پڑی
دے کافر بھویں ہودیں مائل جہاں　　کریں سجدہ اس جا پہ اسلامیاں

نگہہ تیغ مجروح جس کے پڑے — پلک سیل جوں دل میں جا کر گڑے
سیہ چشم اس کے دو بد مست تھے — نگاہوں سے شمشیر در دست تھے
رخ اسکا کہاں اور مہ دخور کہاں — تفاوت زمین آسماں کا ہے یاں
دولب لعل کو جن سے شرمندگی — دم حرف سرمایۂ زندگی
دہن کی جو تنگی نظر کیجیے — تو آگے سخن مختصر کیجیے
نہ ہم تم زنخ دیکھ حیراں رہیں — کبھی دست زیرِ زنخداں رہیں
سراپا میں اس کے جہاں دیکھیے — وہیں ردے مقصود جاں دیکھیے
خراماں نکلتا وہ جس راہ سے — قیامت تھی واں نالہ وآہ سے
فدا اُس پہ جی جان ہر ایک کا — کہ مقصود دل تھا بد و نیک کا
کئی گردو پیش اُسکے وارفتگاں — کئی ایدھر اودھر جگر تفتگاں
بہت رفتگانِ ادائے کلام — بہت مبتلائے بلائے خرام
کوئی کشتۂ شوق رفتار کا — کوئی نیمجاں ذوقِ دیدار کا
کوئی والہ خندۂ برق وش — کسو کے تئیں جنبش لب سے غش
کسو کی نظر میں کمر کی لچک — کسو کے جگر میں پلک کی کسک
کئی حیرتی طرز گفتار کے — کئی آرزوکش ہے پرکار کے
کوئی زلف سے اُسکی مجنوں رہے — کسو کا تبسم سے دل خوں رہے
کوئی دل ستم کشتۂ اک نگاہ — کوئی جاں ہونٹھوں پہ موقوف آہ
کسو پر فسوں گردشِ چشم کا — کسو پر غضب غمزۂ خشم کا
کوئی دست بردل کوئی بیقرار — کوئی بے خبر کوئی بے اختیار
انھوں میں سے اک عاشق زار تھا — اس آفت کو اس سے سرد کار تھا
محبت میں تھا جذب کامل اسے — مراد دل اپنی تھی حاصل اسے
شب وروز ہم بستر کام دل — ہمیشہ ہم آغوش آرام دل
دم اس کے میں یہاں تک تو تاثیر تھی — کہ صحبت اس آتش سے درگیر تھی

بہم ربط چسپاں مبہم اختلاط — نہ کم ہوتی گرمی نہ کم اختلاط
مرو کوئی غم سے کوئی ہو ہلاک — وہ شعلہ اُسی خس سے رکھتا تپاک
کہاں حسن میں تھا وفا کا یہ پاس — یہ سنیئے کہ ہے گا خلاف قیاس
بہت سے بہت اسکا مالوف تھا — اُسی کی تسلّی سے مصروف تھا
کہ ناگہ وہ دلبر ہوا کد خدا — رہا اپنے عاشق سے چندے سے جدا
زن وشو سے اخلاص باہم ہوا — اس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا
نگاہیں بہم دل میں کاوش کریں — سخن سے وفائیں تراوش کریں
ہوا ربط چسپاں بہم اس قدر — کہ دشوار اُٹھے ہمدگر سے نظر
رہیں دونوں دست وبغل روزوشب — کبھو منھ پہ منھ ہو کبھو لب پہ لب
وفانے جو تکلیف کی ایک روز — گیا اپنے عاشق کے وہ دل فروز
کئی دن میں جاکر جو اس سے ملا — کیا اس نے حد سے زیادہ گلا
کہ اے نازنیں آہ کن نے کہا — کہ تو حال سے میرے غافل رہا
مگر سدّ رہ تھا کسو کا فریب — ملا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب
کوئی زلف زنجیر پا ہوگئی — کہ مسدود راہِ وفا ہوگئی
طرح کس کی چتون کی دل میں کھبی — جگر میں پلک شوخ کس کی چبھی
کسو چشم نے تجھ کو جادو کیا — مرے جام عشرت کو لوہو کیا
کہا ان نے تھی کد خدائی مری — نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری
رکھ اب مجھ کو معذور ناچار ہوں — محبت کا میں نوگرفتار ہوں
نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام — طرف اُس کے ہے دل کو میل تمام
اُسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے — دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے
اسے مجھ سے ہے نسبت عاشقی — وہ رہتی ہے بے طاقت عاشقی
نہیں اُس کو یک لحظہ تابِ فراق — جدائی مری اُس پہ گزرے ہی شاق
نہ دیکھے جو مجھ کو تو مرجاوے وہ — وہیں جی سے اپنے گزر جاوے وہ

جو پہونچے مری جھونٹھ اسے بد خبر   تو کر بیٹھے بچ اپنے جی کا ضرر

غرض اُس کو تاب و تحمل نہیں   شکیبائی ہجر بالکل نہیں

یہ سن کر کہا اُس دل افگار نے   ستم کشتۂ دوری یار نے

کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول   یہ مکرزناں ہیں تو ان پر نہ بھول

وفا کن نے ان ناقصوں میں سے کی   موا شوے کسکا کہ وہ پھر نہ جی

یہ ظاہر میں ہر چند ہوں رشکِ ماہ   ولیکن ہیں باطن میں مار سیاہ

خدا مکر سے ان کے دے ہے خبر   نہیں ان سے کوئی فریبندہ تر

جہاں میں فریب ان کا مشہور ہے   زبانوں پہ مکر ان کا مذکور ہے

پئے امتحاں عاقبت یک نفر   مقرر ہوا تا کہ جا اُس کے گھر

کہے غرق دریا ہوا پر سرام   ہوئی زندگانی کی صبح اس کی شام

گیا تھا نہانے کو وقت سحر   سو ڈوبا وہ خورشید روشن گہر

گیا موجِ دریانے سر سے گزار   اٹھا طبع نازک سے اس کے غبار

گیسو جو بکھرے تھے بالائے آب   سواب موج دریا کو کہے پیچ و تاب

پھریں تھیں جو وے انکھڑیاں آب میں   سو وے گردشیں اب ہیں گرداب میں

تمنا میں تھے جس کے سب دل فگار   سو دریا کو اب ہے وہ بوس و کنار

نہ سمجھا وہ نافہم اسرارِ عشق   نہ سوچا وہ ناتجربہ کارِ عشق

کہا غرقِ دریا ہوا پر سرام   ہوا کام اُس رشک مہ کا تمام

کہے تو کہ موجوں کو تھا انتظار   کہ دست و بغل ہوگئیں ایک بار

گیا بیٹھ پانی میں ایسا شتاب   کہ گویا لب آب کا تھا حباب

کنارے پہ دریا کے اک شور ہے   بحال خراب ایک جمہور ہے

گرے ہیں کئی آشنا آب میں   کئی آتش غم سے ہیں تاب میں

کوئی سر پر اس غم سے ڈالے ہے خاک   کسی نے کیا ہے گریباں کو چاک

ہمیں داغ وہ در تردے گیا   بہت آب یہ ماجرا لے گیا

سنا اس کی ہمسر نے جب یہ سخن — ہوا موج زن بحر رنج و محن

نگہ اک طرف ور کے مایوس کی — دم سرد کھینچا گیا ڈوب جی

وہی بیخودی رخصت جان تھی — وہ اک دم کی گویا کہ مہمان تھی

گری ہو کے بیجان وہ دردمند — ہوا شور نوحے کا گھر سے بلند

موئی غم میں اس جملہ تن ناز کے — گئی جان ہمرہ سخن ساز کے

وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا — کہ اس واقعے سے پشیماں گیا

خبر لے گیا اُس کنے زودتر — جو تھا درپے امتحاں بے خبر

کہ وہ رشک مہ امتحاں دے گئی — محبت کے ناموس کو لے گئی

موا سن پہ سرام کے تئیں موئی — مرے اک سخن میں قیامت ہوئی

اگر چہ نہ کچھ اُن نے منہ سے کہا — دیا جی دلے جی اسی میں رہا

یہ سن کر وہ نافہم حیراں ہوا — خجالت سے سر درگریباں ہوا

گیا ہوش سنکر پہ سرام کا — دوانہ ہوا عشق کے کام کا

اٹھا بیخود و بے خرد بے حواس — گرا آکے اس پیکرِ مردہ پاس

لگا کہنے اے مایۂ زندگی — مجھے منہ سے تیرے ہے شرمندگی

کیا جلد رختِ سفر تو نے بار — نہ میرا کیا آہ ٹک انتظار

نہ میری سنی کچھ نہ اپنی کہی — مرے تیرے دونوں کے جی میں رہی

زمیں پر سے آخر اٹھایا اسے — لب آب جاکر جلایا اسے

جب آگ اسکے پیکر پہ سب چھاگئی — محبت عجب داغ دکھلا گئی

یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا — لہو اس کی آنکھوں سے جاری ہوا

جگر غم میں یک لخت خوں ہوگیا — رکا دل کہ آخر جنوں ہوگیا

گئے ہوش و صبر اسکے ایکبار گی — طبیعت میں آئی اک آوارگی

سراسیمگی سے بگولا ہوا — پھرے اسطرح جیسے بھولا ہوا

نہ جی کو تسلی نہ دل کو قرار — کفِ غم میں سر رشتہ اختیار

کبھو یاد کر اُس کو نالاں رہے — کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے

کبھویاں کبھوواں بحال خراب — وہی بیقراری وہی اضطراب

رہے گھر تو آشوبگہ وہ گلی — چمن میں جو لیجائیں تو بے کلی
کبھو متصل ہونٹھ پر آہ سرد — کبھو دست بر دل کہ دل میں ہے درد
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد — لگا بھاگنے سب سے وہ نا مراد
کچھ اپنے بدونیک کی سدھ نہیں — نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں
کبھی جاکے صحرا سے لادیں اُسے — کبھو روتے دریاپہ پادیں اُسے
کبھو خاک ملتا ہے منہ پر کھڑا — کہیں ہے خرابی میں بے سدھ پڑا
سرِشام اک روز دریا گیا — ہوئی رات واں سے نہ آیا گیا
کنارے پہ رہتا تھا ایک دام دار — رہا رات اس کے یہ قرب و جوار
کہا اُسکی عورت نے اس رات کو — نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو
تجھے فکر کچھ اب ہماری نہیں — تو جاتا نہیں شام سے اب کہیں
ترا شبکو دریا میں پڑتا تھا دام — تو چلتا تھا بارے معیشت کا کام
تو جاتا نہیں شب کو جس روز سے — معیشت ہے اندوہ جاں سوز سے
نہیں طاقتِ صبرہم کو تنک — بہت دیر ملتا ہے نان ونمک
وہ بولا کہ میں بھی پریشان ہوں — بہت تنگدستی سے حیران ہوں
کہوں کیا کئی روز سے شام کو — اٹھاتا ہوں میں اس سبب دام کو
کہ یک شعلۂ تند پر پیچ و تاب — فلک سے اترتا ہے نزدیک آب
کوئی دم تو رہتا ہے سر گرم گشت — کبھی سوئے دریا کبھی سوئے دشت
ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں — کہے ہے پر سرام تو ہے کہاں
یہ آتش مرے دل کی کیونکر بجھے — عدم میں بھی میں نے نہ پایا تجھے
کیاعشق نے مجھ کو آتش کا باب — نہ چھڑکا مری آگ پر تونے آب
گیا وہ یہ کہکر سوئے آسماں — رہے ہے مجھے رات دن خوف جاں
سنا حال شعلہ کا صیاد سے — دھواں ایک اٹھا جان ناشاد سے
ہوا شعلۂ شوق دل سے بلند — رہا لوٹتا آگ میں جوں سپند
گئی رات جو توں ہوئی صبح جب — زیادہ ہوئی عشق کی تاب و تب
محبت نے کی اشتعالک کہ وہ — سراسیمہ آیا چلا اس جگہ

جہاں سے اٹھی تھی یہ آتش سلگ
پھر اس کے جگر کو لگی گھر کو لگ

تبسم کناں واں یہ ان نے کہا
کہ کلفت میں غم کی بہت میں رہا

چلو سیر کشتی کو ہنگام شب
لب آب خالی کریں دل کو سب

ہوا سو ہوا یو نہیں تقدیر تھی
جہاں سوز الفت کی تاثیر تھی

نہ ہوتے جو دلگیر یاں متصل
نہ ہوتی یہ آتش کبھو مشتعل

کیاں عقل کی اُن نے باتیں جواں
وہ عاشق جو تھا درپے امتحاں

لگا کہنے یہ آرزو تھی مجھے
کہ اک روز ہشیار دیکھوں تجھے

سو یہ دن خدا نے دکھایا مجھے
سخن تیرے منھ کا سنایا مجھے

ندامت سے ہوں تنگ شاید ہیں سب
گرفتار ہوں ہیں بحال عجب

نہ خجلت سے رو ہے جو کچھ میں کہوں
نہ قدرت اجل پر کہ مر بھی رہوں

نہ تقدیر کا میں نے سمجھا فریب
نہ جانا کہ اتنی ہے نا شکیب

ہوا اک سخن میں مرے یہ غضب
خرابی کا تیری ہوا میں سبب

کروں گا زمانہ میں جب تک معاش
رہوں گا اسی درد سے دلخراش

مقرر کیا ہے کئی دن سے یہ
کہ آئندہ رہئے تری خاک رہ

جو اس میں ہے خوش تو توہوں میں بھی سات
رہینگے لب آب ہی آج رات

دل پر کو خالی کریں گے ہم
پھرینگے ترے ساتھ خوش کوئی دم

ہوئے عاقبت سوئے دریا رواں
نہ پیدا کسو پر یہ راز نہاں

کہ اک آگ سلگی ہے واں پک کنار
محبت کہیں میں ہے سرگرم کار

کسو اشتعالک کی ہے منتظر
جہاں سر کو کھینچا قیامت ہے پھر

ہوئے ناؤ پر شام گہ جب سوار
کہا اُن نے یاں ایک ہے دام دار

اسے سات لو تو بڑی بات ہے
کہ دریا میں پھرنا ہے اور رات ہے

تنک دور چل کر کیا یہ سوال
مجھے ہے ترے حرف شب کا خیال

کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں
کدھر پیچ و تاب آ کے کھاتا ہے یاں

ٹھہرتا ہے کس جادہ آتش فگن
طرف کون سے ہو ہے گرم سخن

یہ صیاد سے تھا ہی محو سراغ
جگر آتش شوق رکھتی داغ

کہ ہو کرفروغ اک سوئے آسماں
تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں

کوئی دم میں دریا پہ آیا فرود
ہوا نیزہ بالا سبھوں کا نمود

لب آب دوشعلۂ جاں گداز
تڑپ کر بہت بازبان دراز

پکارا کہاں ہے پرسرام تو
محبت کا تک دیکھ انجام تو

کہ میں جملہ تن آتش تیز ہوں
دل گرم سے شعلہ انگیز ہوں

بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے
لب آب اتروں ہوں غم میں ترے

مگرسوزش دل ہوکم آب سے
بجھے جی مرا اس تپ وتاب سے

سو یہ آب رکھتا ہے روغن کا کام
کیا عشق نے آہ دشمن کا کام

یہ بیتاب سن کر ہوا بیقرار
سفینے سے اترا بصد اضطرار

ہوا ہمدم اس آتش انگیز سے
کہا اُس بلائے دل آویز سے

مرے بھی جگر میں یہی سوز ہے
یہی مجھ کو جلنا شب وروز ہے

محبت تری برق خرمن ہوئی
تری دوستی جی کی دشمن ہوئی

سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا
کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا

بہم گرمجوشی سے یک جا ہوئے
کہ گزری تھی مدّت بھی تنہا ہوئے

وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل
کہے تو تسلّی ہوئے جان و دل

یکا یک بھڑک کروہ جلنے لگا
پھر ایدھر اُدھر پھر نے چلنے لگا

گیا پاس پانی کے آکر صعود
رہی روشنی سی کوئی دم نمود

پھر آگے کسو پر نہ پیدا ہوا
نجانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا

خبردار ہو اہل کشتی تمام
لگے کہنے باہم نہیں پرسرام

اٹھے ڈھونڈھنے ہوکے سب ناصبور
کنارے پہ دریا کے نزدیک دور

نہ پایا کہیں اس کو حیراں ہوئے
نہایت ہی خاطر پریشاں ہوئے

وہ صیاد بولا کہ دوں میں نشاں
گیا تھا سوئے شعلہ یہ نوجواں

یہ اور اک دونوں ہوئے ہم سخن
وہ شعلہ ہوا اس پہ آتش فگن

نہ ہو آتش غم سے پہلے ہی داغ
چلو اُس طرح کو جو نکلے سراغ

گئے مضطرب حال سارے رواں
تڑپتا تھا وہ شعلہ آکر جہاں

تلاش اس کی اور لے لے کے نام ۔۔۔ پکارے بہت پر کہاں پرسرام
محبت نے ایسا کھپایا اُسے ۔۔۔ کہ ہر گز کسھوں نے نہ پایا اُسے
یقینی ہوا یہ کہ وہ تیز آگ ۔۔۔ اُسی نیم کشتہ سے رکھتی تھی لاگ
لپٹ اسکو شعلہ ہی وہ لے گیا ۔۔۔ عجب طور کا داغ یہ دے گیا
پھرے خوار ہو ہو کے ناچار سب ۔۔۔ کسی کو تحیر کسی کو عجب
کوئی منفعل ساتھ آنے سے تھا ۔۔۔ کوئی برلب آب جانے سے تھا
خصوصاً وہ عاشق ہوا پر خجل ۔۔۔ ندامت ہوئی یہ جسے متصل
نہ تھا اگلی خجلت ہی سے روے حرف ۔۔۔ ہوا دوسرا ماجرائے شگرف
تفکر کے دریا میں ڈوبا ہوا ۔۔۔ کنارے پہ بیٹھا تھا روتا ہوا
کہ پوچھیں گے جو اس کے واماندگاں ۔۔۔ تو یہ واقعہ کیا کروں گا بیاں
کہوں کیونکہ یکبار وہ جل گیا ۔۔۔ کف خاک ہو خاک میں مل گیا
کھنچی جرم کو بے گناہی مری ۔۔۔ ہوئی شہر میں روسیاہی مری
وہ شعلہ جلاتا مجھے کاشکے ۔۔۔ لیے ساتھ جاتا مجھے کاشکے

مقولۂ شاعر

اگر ہے یہ قصہ بھی حیرت فزا ۔۔۔ دلے میر یہ عشق ہے بدبلا
بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے ۔۔۔ بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اس کے لبالب ہے دہر ۔۔۔ جلائے ہیں اس تند آتش نے شہر
محبت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی دریائے عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھیں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہہ نمک اُس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا
واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ — یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے — کہیں یہ خونچکاں شکایت ہے
تھا کسی دل میں نالۂ جانکاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسو کی پلک کی نمناکی — ہے کسو خاطروں کی غمناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں اندوہ جان آگہ تھا — سوزش سینہ ایک جاگہ تھا
کہیں عشاق کی نیاز ہوا — کہیں اندوہ جاں گداز ہوا
ہے کہیں دل جگر کی بیتابی — تھا کسو مضطرب کی بیخوابی
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا — کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا — بیستوں میں شرار تیشہ رہا
کہیں نے بست کو لگائی آگ — کہیں تیغ وگلو میں رکھی لاگ
کبھو افغان مرغ گلشن تھا — کبھو قمری کا طوق گردن تھا

کسو مسلخ میں جاقتارہ ہوا — کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا

ایک عالم میں درد مندی کی — ایک محفل میں جاسپندی کی

ایک دل سے اٹھے ہے ہوکر دود — ایک لب پر سخن ہے خونِ آلود

ک زمانے میں دل کی خواہش تھا — اک سمیں میں جگر کی کاہش تھا

کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ

خار خارِ دلِ غریباں ہے — انتظارِ بلا نصیباں ہے

آرزو تھا امیدواروں کی — دردمندی جگر فگاروں کی

نمک زخم سینہ ریشاں ہے — نگہہ یاس مہر کیشاں ہے

حسرت آلود آہ تھا یہ کہیں — شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں

کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا

کون محروم وصل یاں سے گیا — کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

کام میں اپنے عشق پکا ہے — ہاں یہ نیرنگ ساز پکا ہے

جسکو ہو اس کی التفات نصیب — ہے وہ مہمانِ چندروزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے — کہ وہ نا چار جی سے جاتا ہے

آغاز قصہ جانگداز

ایک جا اک جوان رعنا تھا — لالہ رخسار وسرو بالا تھا

عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم

شوق تھا اس کو صورتِ خوش سے — اُنس رکھتا تھا وضع دلکش سے

تھا طرحدار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

کوئی ترکیب اگر وہ کوئی خوش پرکار — رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار

زلف ہوتی کسو کی گر برہم — دیکھتے اُس کے حال کو درہم

دیکھتا گر کہیں وہ چشم سیاہ — دل سے بے اختیار کرتا آہ

سر میں تھا شور شوق دل میں تھا
عشق ہی اس کے آب وگل میں تھا

الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب
نا شکیبار ہے تھا بے محبوب

ایک دن بے کلی سے گھبرایا
سیر کرنے کو باغ میں آیا

کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا

اک خیابان میں سے ہو نکلا
ایک سائے تلے سے رونکلا

نہ تسلّی ہوا دل بیتاب
نہ تھما چشمِ تر سے خون ناب

دل کی واشد سے بے توقع ہو
ہرشجر کے تلے بہت سارو

دیکھ گلشن کو نا امیدانہ
منھ کیا اُن نے جانب خانہ

دل کے رُکنے کا اسکواک غم تھا
راہ چلتے میں خیال درہم تھا

ناگہ اُس کوچہ سے گزار ہوا
آفت تازہ سے دوچار ہوا

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
تھی طرف اُسکے گرم نظارہ

پڑگئی اُس پہ اک نظر اُس کی
پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی

تھی نظر یاکہ جی کی آفت تھی
وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بیقراری نے کج ادائی کی
تاب وطاقت نے بے وفائی کی

منھ جواس کا طرف سے اس کے پھرا
مضطرب ہوکے خاک پر یہ گرا

وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُسکا
بیطرح ہودے گوکہ حال اس کا

جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ
اُٹھ گئی سامنے سے یکبارہ

وہ گئی اُس کے سر بلا آئی
خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک

طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگ خوں کیا پیدا

سوزش دل نے جی میں جاگہ کی
داغ نے آجگر کوآتش دی

بستر خاک پر گرا وہ زار　　درد کا گھر ہوا دل بیمار
خاطر افگار خار خار ہوئی　　جاں تمنا کشِ نگار ہوئی
اُسکے منہ پر پڑی جو اس کی نگاہ　　نا امیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ
خوہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ　　رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ
ہونٹھ سوکھے تو خون ناب ملا　　خواب و خور دونوں کو جواب ملا
خلق اُس کی ہوئی تماشائی　　پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے　　رو دیا اُن نے ایک حسرت سے
جاکے اُسکے قریب در بیٹھا　　قصہ مرنے کا اپنے کر بیٹھا
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا　　شوق نے کام کو خراب کیا
جو کہ سمجھے تھے اُس کو دیوانہ　　رحم کرتے تھے آشنایانہ
عاشق اُس کو کسو کا جان گئے　　سب بُرا اس ادا کو مان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی سب کی　　ایک جابود و باش تھی سب کی
وارث اُس کے بھی بدگمان ہوئے　　درپئے دشمنی جان ہوئے
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں　　دفعتاً اُس بلا کے تئیں ٹالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہونگے ہم بدنام　　سن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہہ تھا کہ یہ جواں مارا　　کن نے مارا اُسے کہاں مارا
ہووے یہ خون خفتہ گر بیدار　　کھینچنی ہووے خفتِ بسیار
کیجئے ایک ڈھب سے اسکو تنگ　　تانہ عاید ہو اپنی جانب ننگ
تہمت خبط رکھیے اُس کے سر　　کیجئے سنگسار اُس کو پھر
دے کے دیوانہ اُس جواں کو قرار　　ہوگئے سارے درپئے آزار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا　　ایک نے آکے زیرِ سنگ کیا
ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر　　ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر
کی اشارت کہ کودکانِ شہر　　آئے لبریز غصۂ و پر قہر

گرچہ ہنگامہ اُسکے سر پر تھا — لیک روئے دل اُسکا اودھر تھا
محو تھا اُس کے یہ خیال کے بیچ — تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
ہونٹھ پر حسن کا بیان اس کا — تھا سروسنگ آستاں اُس کا
ایک دم آہِ سرد بھر اُٹھنا — نالۂ گرم گاہ کر اُٹھنا
جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے — اسطرف یک نگاہ مشکل ہے
دوست کو میرے نام سے ہے ننگ — دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ
چشمِ ترسے لہو بہاکرتا — صبح کے باد سے کہا کرتا
کائے نسیم سحر یہ اس سے کہہ — مت تغافل کر اور غافل رہ
ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیے — جان پر آبنی ہے تیرے لیے
جان دوں تیرے واسطے سو تو — آنکھ اُٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی — دور پہونچی ہے میری رسوائی
نام کو بھی ترے نہ جانا آہ — تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ
نا اُمیدانہ گر کروں ہوں نگاہ — دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ
سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد — ایک میں خوں گرفتہ سو جلّاد
کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق — بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق
نالہ ہوتا ہے گہہ گہے دل جو — گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو
آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل — جی ہے اس سے اسیر آب وگل
ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی — صورت اک معنی نہاں ہوتی
اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات — ایک میں اور کتنے تصدیعات
سنگباراں سے سخت ہوں دلتنگ — شیشہ دل نہیں ہے پارۂ سنگ
محرم یک نگاہ بیش نہیں — کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں
کیونکہ کہیئے کہ تو نہیں آگاہ — اک قیامت بپا ہے یاں سرراہ

کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز ۔۔۔ اک جہاں اس سے ہے خبر پرواز

بس تغافل ہوا ترحم کر ۔۔۔ گوشِ دل جانب تظلم کر

کون کہتا ہے رہ نہ محوناز ۔۔۔ پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز

اُن بلاؤں پہ ان نے صبر کیا ۔۔۔ اختیار اپنے جی پہ جبر کیا

اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا ۔۔۔ اس کے اندوہ سے نہ منھ موڑ

اور یہ ماجرا مشہور ۔۔۔ شور رسوائیوں کا پہونچا دور

دیکھ کر اُس کو بیخورو بیخواب ۔۔۔ جانا ہر اک نے عاشق بیتاب

منھ پر اس کے جو رنگ خون نہیں ۔۔۔ عشق ہے اس کو یہ جنون نہیں

ہے نگہہ اُس کی جس طرف مائل ۔۔۔ اُس طرف ہی گیا ہے اسکا دل

جب ہوا ذکر اقل واکثر میں ۔۔۔ چاہ ثابت ہوئی اُسے گھر میں

عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا ۔۔۔ مضطرب کدخدائے خانہ ہوا

گھر میں جا بہر دفع رسوائی ۔۔۔ بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی

یاں سے یہ غیرت مہہ تاباں ۔۔۔ جاکے چندے کہیں رہے پنہاں

پار دریا کے جلد رخصت کی ۔۔۔ اس طرح فکر رفع شفقت کی

گھر تھا اک آشنا کا مدّ نگاہ ۔۔۔ واں ہو روپوش تایہ غیرت ماہ

ہووے جب اس بلا سے خاطر جمع ۔۔۔ نورافزائے خانہ ہو جوں شمع

گھر سے باہر محافہ جو نکلا ۔۔۔ اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا

طپش دل سے ہوکے یہ آگاہ ۔۔۔ ہولیا ساتھ اُس کے بھر کر آہ

واں کے رہنے سے اس کو کام نہ تھا ۔۔۔ وہ گلی اس کا کچھ مقام نہ تھا

جس سے جی کو کمال ہو الفت ۔۔۔ جس سے دل کی درست ہو نسبت

جنبش اُس کی پلک کو گرداں ہو ۔۔۔ دل میں یاں کاوش نمایاں ہو

واں اگر موشکست کا ہو باب ۔۔۔ یاں رگ جاں کو ہووے پیچ و تاب

واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار ۔۔۔ دل سے یاں سر نکالے ہی یکبار

یار کو درد چشم اگر ہووے
چشم عاشق لہو میں تر ہووے

چاک دامن ہیں واں پے زینت
یاں گریباں ہے چاک گل کی صفت

واں دہن تنگ یاں ہے دلتنگی
حسن اور عشق میں ہے یکرنگی

دست افشاں وہ پائے کوباں یہ
تھا محانے کے ساتھ گرم رہ

قطرہ زن اشک سادہ راہ تمام
درپے یار تھا یہ بے آرام

ہر قدم تھا زبان پر جاری
خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری

ہمسری اُس کی تھی میسر کب
ہے مجھے بخت داژگوں سے عجب

شوق مفرط نے بے تہی کی سخت
نوشکیبی نے دل سے باندھا رخت

رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے
اُڑنے لاگے جگر کے پرکالے

اضطراب دلی نے زور کیا
ان نے بے اختیار شور کیا

دل کے غم کو زبان پر لایا
آفت تازہ جان پر لایا

کائے جفا پیشہ و تغافل کیش
اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش

منہ چھپایا ہے تو نے اپر بھی
نگہہ التفات ادھر بھی

صبر کس کس بلا سے کر گزروں
چارہ اس بن نہیں کہ مرگزروں

منزل وصل دور میں کم پا
تجھ کو اس مرتبے میں استغنا

ہے تو نزدیک دل سے اے طناز
لیک تجھ تک سفر ہے دور دراز

ناز نے یک نفس نہ رخصت دی
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی

تو تو واں زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خال رُخ پہ نگاہ
دل مرا مبتلائے داغ سیاہ

تجھ کو مد نظر تھی اپنی چال
میں ستم کش ہوا کیا پامال

بستر خواب پر تجھے آرام
مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے کام

واں لب لعل تیرے خنداں تھے
یاں فشردہ جگر پہ دنداں تھے

ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے
رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر　　حال پر میرے ٹک تاسف کر

گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن　　تھی وہ اُستاد کارِ حیلۂ وفن

پاس اُس کو بلا تسلّی کی　　وعدہ وصل سے تشفی کی

کاے ستم دیدہ غم دوری　　ہوچکا اب زمانِ مہجوری

زار نالی نہ کر شکیبا ہو　　عشق کا راز تانہ رسوا ہو

دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے　　چل کوئی دم کو داد خواہش دے

سخت دلتنگ تھی یہ غیرت ماہ　　قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ

گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے　　اُسکی بھی جذب اشتیاق سے ہے

تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا　　نشہ دوستی زیادہ ہوا

بزمِ عشرت کریں گے باہم ساز　　ہو جواب اپنے دوست کا و مساز

دے کر اُس کو فریب ساتھ لیا　　دلِ عاشق کو اپنے ہاتھ لیا

لیکن در پر وہ اُن نے یہ ٹھانی　　کیجئے اس سے خصمی جانی

یہ تو دل تفتۂ محبت تھا　　سخت دارفتۂ محبت تھا

وقت نزدیک تھا جو آپہونچا　　تاسیرآب پاپیا پہونچا

آب کیسا کہ بحر تھا ذخار　　تند و موّاج و تیرۂ وتہہ دار

موج کا ہر کنایہ طوفاں پر　　مارے چشمک حباب عماں پر

ہمکنار بلا ہر اک گرد اب　　لجہ سر مایہ بخش تیرہ سحاب

گزرِ موج جب نہ تب دیکھا　　ساحل اُس کا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اک آن کر ہوئی موجود　　ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

کی کنارے پہ لاکے استادہ　　تھا محافہ رکوب آمادہ

اس سفینے میں جلد جاپہونچا　　یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا

بیچ دریا میں دایہ نے جاکر　　کفش اس گل کی اسکو دکھلا کر

پھینکی پانی کی سطح پراکبار　　اور بولی کہ اوجگر افگار

حیف تیرے نگار کی پاپوش　　موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرت عشق ہے تو لا اُس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُسکو

اُس طرف آب کے اُترنا ہے
اس نواحی کی سیر کرنا ہے

پاؤں اُس کے جو ہیں نگار آلود
ظلم ہے ہوویں گرغبار آلود

جس کفِ پا کو رنگ گل ہو بار
منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار

ان پہ نرمی میں گل سے ہوں جو پرے
آبلہ چشم کو سیاہ کرے

یہ رواہے تو اپنے حال پہ رو
مفت ناموس عشق کو مت کھو

جی اگر تھا عزیز اے ناکام
کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

سنکے یہ حرف دایۂ مکار
دل سے اُس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کار عشق کی تہہ سے
جست کی اُن نے اپنی جاگہہ سے

تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
موج زنجیر ہوگئی پا میں

کھینچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب
تھی کشش عشق کی مگر تہ آب

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں

ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے
غرق دریائے عشق کیا نکلے

عشق نے آہ کھودیا اس کو
آخر آخر ڈوبودیا اُس کو

جبکہ دریا میں ڈوب کر وہ جوان
کھوگیا گوہر گرامی جان

خار خار دلی سے فارغ ہو
لے گئی پار اُس گل نوکو

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

خاک ہو کیوں نہ عاشق بیدل
کام سے اپنے یہ نہیں غافل

وصل جیتے نہ ہو میسر اگر
لاوے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد
خاک خوباں بھی اُن نے دی برباد

قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ
آئی وہ رشک مہ زخود رفتہ

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ
ہوگیا غرق وہ فرومایہ

اب تو وہ تنگ درمیاں سے گیا
آرزو مند اس جہاں سے گیا

تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد
ساتھ اس کے گئے وے شور و فساد

شور فتنے تھے اس تلک سارے
ابتو بدنامیاں نہیں بارے

دل تڑپتا ہے متصل میرا
مرغ بسمل ہے یا کہ دل میرا

وحشت طبع اب تو افزوں ہے
حال جی کا مرے دگرگوں ہے

بیدماغی کمال ہوتی ہے
جان تن کے وبال ہوتی ہے

دل کوئی دم میں خون ہوویگا
آج کل میں جنون ہو وے گا

بے کلی جی کو تاب دیتی ہے
طاقت دل جواب دیتی ہے

جی میں آتا ہے ہوں بیابانی
پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی

گاہ باشد کہ دل مرادا ہو
ورنہ کیا جانئے کہ پھر کیا ہو

دایہ بولی کہ اے سراپا ناز
حسن کا درپہ تیرے روئے نیاز

اب تو میں فتنے کو سلایا ہے
اس بلا کے تئیں بٹھایا ہے

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا
سدّرہ کون ہے نکلنے کا

ہو محافے میں دلخوشی سے سوار
شاد شاداں کر آب سے تو گزار

دل سے اپنے پدر کے غم کم کر
مادرِ مہرباں کو خرم کر

کرملاقات ہمدموں سے تو
گرم بازی ہو محرموں سے تو

یہ نہ سوچی کہ بدبلا ہے عشق
گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے
عاقبت اُس کو مار رکھتا ہے

جذب سے اپنے جب کرے ہے کام
عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام

صبح گا ہاں وہ غیرت خورشید
اس جگہ سے رواں ہوئی نومید

پہونچی نصف النہار دریا پر
روئی بے اختیار دریا پر

حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی
دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ
یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش
تھا تلاطم سے کسطرف ہمدوش

تجھ کو آیا نظر کہاں آکر
پھر جوڈوبا تو کس جگہ جاکر

مجھ کو دیجو نشان اُس جاکا
میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

ہوں میں نا آشنائے سیرآب
ناشناسائے موجۂ وگرداب

لجہ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں
گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں

ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور — اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
مگر میں گرچہ داپہ تھی کامل — ایک تہہ سے تخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق — ہے یہ مہہ پارہ نا شکیب عشق
بیچ دریا کے جاکہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند — پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکر — گر پڑی قصد ترک جاں کرکر
موج ہر اک کمند شوق تھی آہ — لپٹی اُس کو برنگ مار سیاہ
دام گسترده عشق تہہ آب — جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آدئے — نورِ مہتاب جیسے لہراوے
تھیں وہ اُس کی حنائی انگشتاں — غیرت افزائے پنجۂ مرجاں
سر پہ جسدم کہ آب ہو کے بہا — سطح پانی کا آئینہ سا رہا
کشش عشق آخر اُس مہہ کو — لے گئی کھینچتی ہوئی تہہ کو
کودے غواص و آشنا سارے — تابمقدور دست و پا مارے
کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب — نہ لگا ہاتھ وہ در نایاب
جا ہم آغوش مردہ یار ہوئی — تہہ میں دریا کے ہمکنار ہوئی
پاک کی زندگی کی آلایش — ہوکے دست وبغل کی آسایش
سرپٹکتی جو گھر گئی دایہ — آفت اک لے گئی نئی دایہ
اب و عم مادر و برادر سب — خاک افشاں بسرو نالہ بلب
دارو دستہ تمام اُس گل کا — ترک آئین کر تجمل کا
سوئے دریارواں ہوئے گریاں — آتشِ غم سے دل جگر بریاں
خلق یکجا ہوئی کنارے پر — حشر برپا ہوئی کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا — آخر اُن کو اسیر دام کیا
نکلے باہم دے موئے نکلے — دونوں دست وبغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہو یدا تھا — مرگئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالین — ایک کے لب سے ایک کو تسکین

جو نظروں کو آن کرتے تھے ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی دار ہمد گر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہووے انکا فصل جان دیدے ہواہو جنکا وصل
حیرت کار عشق سے مردم شکل تصویر آپ میں تھے گم

مقولۂ شاعر

میر اب شاعری کو کرموقوف عشق ہے ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے اس سے جو تو کہے سوآتا ہے
کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے کتنی طاقت تری زباں میں ہے

لب پہ اب مہر خامشی بہتر
یاں سخن کی فرامشی بہتر

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی عشقیہ

چمن سے عنایت کے بادام دار
الٰہی زباں دے مجھے مغزدار

صفت عشق کی تا کروں میں جاں
رہوں عشق کہنے سے میں تر زباں

عجب عشق ہے مرد کار آمدہ
جہاں دونوں اسکے ہیں بر ہمزدہ

جہاں جنگ صف کی یہ ظالم لڑا
صف الٹی جہاں ایک مارا پڑا

اگر لوگ مارے گئے سر بسر
دلے فتح اس کی ہے یہ طرفہ تر

کوئی کشتنی جو طرف ہوگیا
تہہ تیغ اس کے تلف ہوگیا

جہاں جس کسو سے اسے چاہ ہے
وہیں اُس کے تاقتل ہمراہ ہے

کسوسے اگر ہو گئی لاگ سی
درونے میں اس کے لگی آگ سی

ہوا ملتفت یہ کسو سے کہیں
تو نام ونشاں اس کا پھروان نہیں

وفاق اس کا نکلا سراسر نفاق
پڑا عاشقوں میں عجب اتفاق

جواں کیسے کیسے موئے عشق میں
بہت گھر خرابے ہوئے عشق میں

بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے
بہت خاک مل منھ پہ جوگی ہوئے

گئے وشت میں کچھ نمدمو ہوئے
کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو ہوئے

نہ مرغ چمن ہی ہے نالان وزار
گئے داغ کہسار سے لالہ زار

کسوکا جگر غم سے خوں ہوگیا
کسو کوہ کن کو جنون ہوگیا

کوئی زار باراں بہت روچکا
کوئی برق سا جل بجھا ہوچکا

غرض عشق کا ہر طرف شور ہے
نئی روز شہروں میں اک گور ہے

بہت جان ناکام دیتے گئے — تمنائے دل ساتھ لیتے گئے
بہت اہل اسلام کافر ہوئے — بہت اول عشق آخر ہوئے
بہت جرم الفت پہ مارے گئے — جو اعشق بازی کا ہارے گئے
ہوئے خاندان کیسے کیسے خراب — جواں جوں جوانی گئے کیا شتاب
کیا عشق جس دن سے مرتے رہے — جیون ہی کا اندیشہ کرتے رہے
دوا عشق کی سخت نایاب ہے — سر عاشقاں سنگ کا باب ہے
جو ہو عشق عارض تو پھر یاس ہے — عبث کوئی دن جینے کا پاس ہے
محبت ہے نیرنگ ساز عجیب — فسانے ہیں اُسکے عجیب و غریب
کوئی عشق کرنا دھراتھا ورے — گئے میکدے سے بھی صوفی پرے
نہ واں مکردنے شید و طامات ہے — خرابات جانا کرامات ہے
کہیں عشق نے آرزو کش کیے — گئے خوش جو عاشق سونا خوش گئے
کہیں سہل تر یار مرنے لگے — کہیں لوگ دشوار مرنے لگے
کہیں کام ان نے کیے ہیں عجب — فسانہ ہوئی بزم عیش وطرب
کہیں بادشہ اس سے درویش ہیں — کہیں اس سے درویش دلریش ہیں
یہ عالم کا آشوب ہے دہر سے — مراد خطر گھہ ہے اس شہر سے
ہوئے عشق میں زہد کیشاں خراب — رہے دل شکستہ پریشاں خراب
اُٹھا عشق کا شور عزلت گزیں — گئے دشت گردی کو کر ترک دیں
ہوا عشق سے مجلس حال دہر — تو اجد لگے کرنے شیخانِ شہر
کیا عشق میں ترک صوم وصلوٰت — گئے اہل مسجد سوئے سومنات
مسلماں ہوئے عشق میں برہمن — گئے کعبہ کو چھوڑ دین کہن
نہ سبحہ نہ زنار نہ کفرو دیں — یاں سب ہے عشق اور کچھ بھی نہیں
محبت کے ساغر کش اہل صلاح — بیہوش دارو ہے ان کی فلاح
کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں — ہر اک چپ ہے کچھ کوئی کہتا نہیں

رباطی ہیں خانہ سیہ عشق میں
مصلّے ہوئے ان کے تہہ عشق میں
ہمہ خاندان تفاوت خراب
خرابے سے ہیں بے تفاوت خراب
یہی عشق جس سے کہ حاصل ہے کام
یہی عشق سے نای اُمیداں امید
یہی عشق ہے عقدۂ دل ہے یہ
یہی عشق حلال مشکل ہے یہ
کہیں اس کو لڑنے سے پایا معاف
کہیں ان نے میدان مارے ہیں صاف
کہیں مومنانہ اسے درد دین
کہیں کافرانہ ہوا بے یقین
غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز
کہیں ناز یکسر کہیں ہے نیاز

حکایت

حکایت ہے عشقی حکایات میں
کہ افغاں پسر ایک گجرات میں
جواں خوش تھا پرکارو پرہیزگار
بہت حسن کا اس کے واں اشتہار
یہ صورت یہ طاعت یہ دامانِ پاک
نہ دامن پہ مانند گل گردخاک
اگر ہووے حور بہشتی دوچار
وہ دریائے حسن اس سے ڈھونڈھے کنار
وگر آگے سے ہو پری کا گزر
حیا سے نہ اُس پر کرے ٹک نظر
رہے محو پا کیزگی وصلوٰۃ
نہ ہوں ترک سہواً کبھی واجبات
تناسب اُسکے اعضا سے خوب
سراپا میں دیکھو تو ہر جا سے خوب
زباں نرم طالع دری وصلاح
نہ طنزو کنایہ نہ رمزو مزاح
خوش اندام و خوش رودپاکیزہ خو
کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو
جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف
لب سرخ پردلبروں کا نہ حرف
حیا کو سیاہی سے پلکوں کی راہ
نکلتی تھی باہر نہ گاہے نگاہ
بہت پاک دامن معیشت ہوئی
نظافت نزاہت میں مدت ہوئی
کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی
جبیوں پر خدا جانے کیا بن گئی
جواں کی نظر شرگیں جالڑی
وہ شرمائی آنکھ اُسکے اوپر پڑی
نہ دل مستقل نا شکیبا ہوا
دل طرف ثانی بھی بیجا ہوا

حیادار تھی زن گئی اپنے گھر | وفادار تھا یہ رہا دیکھ ادھر
کیا چند شرط وفا ہی کا پاس | لگے رہنے دونوں گھروں میں اداس
کئی دن میں ہندوزن آنے لگی | لیے پانی اس راہ جانے لگی
نگاہیں ہوئیں ہمدگر آشنا | محبت کا دونوں نے پانی بھرا
یہی مدّتوں دیکھا دیکھی رہی | دلوں کی کسو سے نہ ہر گز کہی
جیون میں شب و روز مرتے رہے | ولے پاس ظاہر کا کرتے رہے
رہے دیر تک دونوں ناکام عشق | نہ آیا لبوں پر کبھو نام عشق
یہ کیا دخل اظہار الفت کریں | یہی بستہ لب شق حیرت کریں
گھروں میں نگاہیں تھیں کلفت بھری | درو بام پر پڑتیں حسرت بھری
لبوں پر نہ آیا کبھو حرف عشق | اگرچہ ہمہ تن رہے صرف عشق
بجایا کیے پردے میں سازِ دل | نہ نکلا کوئی نغمۂ رازِ دل
دوانوں میں تو گرمجوشی رہی | دہانوں پہ مہر خموشی رہی
کریں حسرت آگیں نگہہ چار اور | لب اُن کے یہ ساکت سرونمیں یہ شور
کسو سے نہ حرف وحکایت انہیں | محبت سے شکرو شکایت انہیں
کہیں دردِ دل سو کبھو زیرِ لب | دگر نہ سکوت اُن کو تھا جب نہ تب
شب و روز دونوں تھے صورت مثال | بہم محو خوبی و صرف خیال
پئے جائیں آنکھیں بھری بہرِ ضبط | کہ جانا جاوے یہ آپس کا ربط
کبھو آہ اُٹھتی تو دم سرد ہو | کہیں منکشف تا نہ یہ درد ہو
دلوں میں جو تھی چاؤ خوں ہوگئے | گرفتہ رہے سوجنوں ہوگئے
بیاباں کی جانب کھنچے دل بہت | کہ تھا شہر میں کام مشکل بہت
ارادے ہوئے یہ دلوں میں ہی خون | کیا پھر بھی دونوں نے صبر و سکون
صبا سے رہے دو طرف کے پیام | کہ اے باد کہیو یہ بعد از سلام
خیالات ملنے کے جاتے نہیں | قرار و سکوں دل تک آتے نہیں
شب و روز رہتا ہے یاں اضطراب | کیا شوق نے کام کو کیا خراب

کوئی طور ملنے کا ایجاد کر / نہ جو رحم سے ہو تو بیداد کر
پیام ایک کا یہ کہ اے بادِ نرم / کہہ اسکو محبت سے کچھ بھی ہے شرم
تن زار بیجان کیونکر جیے / جگر میں نہ ہو خوں تو کیا خوں پیئے
ملاقات کا رکھے کیونکر خیال / رہے کیونکہ جاں تا امید وصال
اگر دیکھیں آنکھیں ہیں دو اسطرف / وگر منھ ہمارا ہے سواس طرف
اسے دیکھنا ہی ہے ارمان بھی / ادھر ہی چلی جائے ہے جان بھی
کہ اس سے کہ مرتے ہیں تیرے لیے / لبوں سے جگر تک بھرے ہیں گلے
کسو سے کسو کو نہ ہوجائے لاگ / کبھے تو لگائی ہے سینے میں آگ
کسو کا کسو سے نہ لگ جائے دل / کہ کہنا پڑے ہائے دل وائے دل
کسو کی نہ اچھی لگے کوئی آن / کہ جانِ المناک دیجے ندان
کسو کے مجعد نہ کھل جائیں بال / کہ ہو دل کے عقدوں کی واشد محال
کسو لالہ رُخ کا نہ اٹھے نقاب / کہ ہوں داغ دونوں مہ و آفتاب
قدآرانہ ہو فتنہ درسرکوئی / کہ سر پر قیامت رکھے ہر کوئی
کسو کے نہ چاہ زنخ میں گریں / مبادا کہ واں سے نہ جیتے پھریں
کسو کے نہ انداز پر جا سے جا / صبا ہوئے کیا جانیے کیا سے کیا
کسو کی نہ آنکھوں کو دیکھا کریں / کہ لوگ اس کا آخر پر یکھا کریں
کسو کے نہ ایمائے ابرو پہ جائیں / فریب فریبندگاں تانہ کھائیں
صبا چلتے اس سے یہ کہہ آئیو / کہ غافل ہی ہم سے نہ ہو جائیو
دل زار تجھ بن ہے بے کل بہت / نہ جی کو مرے بن ملے مل بہت
گئے ہم سے پھر ہاتھ آتے نہیں / یہ گم گشتہ پھر پائے جاتے نہیں
انہیں کا نہیں رہتا نام و نشاں / کوئی ان کو ڈھونڈھے تو پھر یہ کہاں
کبھیں یوں فراموش ہوتے ہیں یار / ہمارا ترا عشق ہے یادگار
ترحم کہ اب بھی گیا کچھ نہیں / تلطف کہ ہم میں رہا کچھ نہیں
نہ کریوں کہ افسوس باقی رہے / گل تر پہ چنداوس باقی رہے

گھٹی جان جاتی ہے یوں ہر زماں — تلف جیسے ہر دم ہو آب رواں
نہ ہو جاتی اے کاش الفت ہمیں — اٹھانی نہ پڑتی یہ کلفت ہمیں
نہ آنکھیں لگی ہوتیں ناگاہ کاش — کہ چھاتی کی دل تک نہ جاتی خراش
نہ دل کو ہوئی ہوتی چسپیدگی — کہ داغوں کو ہوتی نہ بالیدگی
نہ پڑتی مری آنکھ گر اسکی اور — تو اُٹھتا نہ سر سے جنوں کا یہ شور
ہوئی آتش عشق آخر بلند — جگر دل ہوئے دونوں اس کے سپند
زبانے تھے اس آگ کے کیا دراز — ہوئی دونوں بیتابوں کی جاں گداز
پڑی آگ وہ دل جگر جل گئے — جگر دل نہ بل دونوں گھر جل گئے
ہوا ناگہاں شوہر زن مریض — نہایت ہوئی تپ طویل و عریض
تشتت ہوا تپ کا دل کے تئیں — کھنچی رفتہ رفتہ دق وسل کے تئیں
نزاری سے دل ہوگیا زار تر — ہوا خشک ہوکر وہ بیمار تر
بدن کاہ سارنگ کا ہی ہوا — بہت حال اس کا تباہی ہوا
دموں پر بھی وہ رفتنی کم رہا — ٹھہر کر گئے دم ہوا ہوگیا
فنا یعنی طاری ہوئی ہوچکا — اسے دار ودستہ بہت روچکا
جلانے کی تیاری کرنے چلے — چلی زن بھی تا ساتھ اس کے جلے
کھلی دعوی سوختن میں زبان — کیا پاس ظاہر سے نقصان جان
لگی جلنے چھوڑا نہ اصرار کو — خبر پہونچی اس نوگرفتار کو
جھکا آگ کی اور کر اضطراب — کہ جی میں نہ طاقت تھی نہ تاب
کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی — نظر اسکی جلتے جو اُس پر پڑی
کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم — شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم
یہ بیتاب تھا آگ پر پھر پڑا — پتنگا سا اُسکا شعلے پر گر پڑا
لگے آتے تھے کتنے انفار ساتھ — وہیں کھینچ لائے اُسے ہاتھوں ہاتھ
چلے ادھ جلا لے کے سب اسکو گھر — ہوا گرم ہنگامہ اک یہ ادھر
کیا لوگوں نے اس کے سر پر ہجوم — ہوئی شہر میں شور محشر کی دھوم

قدم کتنے چل کر وہ آتش بجاں ہوایوں سخن زن کہ اے دوستاں
تعب کش ہوں میں آتش تیز کا اُسے قصد تھا میرے خونریز کا
لے آئے مجھے گرمی سے تم نکال کیا گھر بھی لے چلنے کا اب خیال
نہیں متصل راہ چلنے کی تاب کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب
کوئی دم مرا کھینچے انتظار کہ گرمی سے ہوں بخودو بے قرار
توقف کیا سب نے زیر درخت کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت
نہ جانا کہ مانع راہ عشق رکھے ہے عجب جذب جانکاہ عشق
نہ آتش نہ گرمی نہ بے طاقتی بہانے ہیں سب جذب ہے باقی
اٹھانے کو کہنے تو کہلائے تھا دل اس کا ادھر ہی چلا جائے تھا
اگر آنکھیں کھلتیں تو اودھر نظر ہوئی خاک معشوقہ جل کر جدھر
گیا منتظر اُس کو وہ دن تمام نظر کر کے کیا دیکھتا ہے کہ شام
خراماں چماں آتی ہے وہ پری وہی ناز عشوہ وہی دلبری
وہی صورت اس کی ہے جلوہ نما وہی رنگ روگل کا غیرت فزا
اسی طرز وانداز و خوبی کے ساتھ اُٹھایا اُسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ
گئی اس طرف لے جدھر تھی جلی نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی
ولے مانعیت کا کس کو جگر کہ حیران سب رہ گئے دیکھ کر
ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں گیا عشق کیا جانے لے کرکہاں
بہت سے ہوئے لوگ گرم سراغ کنھوں نے پایا نشاں غیرداغ

نہ کر میراب عشق کی گفتگو
قلم اور کاغذ کو رکھدے بھی تو

فسانے ہیں اسکے ہزاروں ہزار یہی کشت وخوں کا ہے یہ گرم کار
بہت خاک جل جل کے یاں ہوگئے رہ عشق میں جی بہت کھوگئے

غرض ایک ہے عشق بے خوف و باک
کئے دونوں معشوق عاشق ہلاک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی معاملاتِ عشق

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق ... حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ ... عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق تھا جو رسول ہو آیا ... اُن نے پیغام عشق پہونچایا
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں ... ہے محمدؐ کہیں علیؑ ہے کہیں
عشق عالیجناب رکھتا ہے ... جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق حاضر ہے عشق غائب ہے ... عشق ہی مظہر عجائب ہے
عشق کیا کیا مصیبتیں لایا ... روز کو رات کرکے دکھلایا
عشق میں لوگ زہر کھاتے ہیں ... عشق سے رنگ سبز پاتے ہیں
عشق سرتاقدم اُمید ہوا ... زیرِ تیغ ستم شہید ہوا
مجھ سے مت پوچھ یہ کہیں ہے عشق ... عشق ہے انہیں کو جنہیں ہے عشق
عشق سے رنگ زرد ہوتا ہے ... عشق سے دل میں درد ہوتا ہے
رہتے ہیں عشق ہی میں مژگاں تر ... یہیں دیکھی، ہیں آنکھیں آتے بھر
عشق ہی کا خراب ہے کنعاں ... عشق ہے ایک خانہ آباداں
عشق لایا ہے آفتیں کیا کیا ... اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا
قیس کیا رنج کھینچ کھینچ موا ... سر پہ فرہاد کے سنا جو ہوا
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں ... آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
عشق میں ایک جی کو کھو بیٹھے ... ایک آنکھوں کو روکے رو بیٹھے
ایکوں کا جیب تابدامن چاک ... ایک ڈالے ہے سر کے اوپر خاک
شان ارفع ہے جنگی خوار ہیں یاں ... عقل والے جنوں شعار ہیں یاں
خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے ... بادشہ عشق میں فقیر ہوئے
کوئی ولتنگ ہو کنویں میں گرا ... کوئی ڈوبا کوئی گیا نہ پھرا

جب پتنگا ہوا تھا اس سے داغ
تب دیا جی کو ان نے پیش چراغ

عشق کی فاختہ ستم کش سمکش ہے
عشق سے عندلیب دلکش ہے

عشق باعث ہوا وطن چھوٹے
مرغ پکڑے گئے چمن چھوٹے

مایۂ درد ورنج سب ہے عشق
متصل رونے کا سبب ہے عشق

پڑگئے دل جگر میں آخر چھید
کچھ نہ پایا کنھوں نے عشق کا بھید

اپنی تیغ ستم جوا ینچے عشق
جائے بہتوں کے خوں میں کھینچے عشق

عشق سے قمری ہے حریف سرو
مہ سے آنکھیں لڑا رہا ہے تذرو

عشق کے دل فگار سارے ہیں
ان نے کیا کیا جوان مارے ہیں

کہیں حق ناحق ان نے خون کیے
کہیں سر پر کھڑا ہے تیغ لیے

کوئی محوگزاف ہیں اس سے
کہیں میدان صاف ہیں اس سے

اس سے یک جمع نے لیا ہے جوگ
ایک فرقہ کا ہے یہ جی کا روگ

ایک کے لب پہ آہ ہے اس سے
ایک کا دن سیاہ ہے اس سے

ایک کا شیوہ اس سے نالہ کشی
ایک کو بیدلی ہے جیسے غشی

ایک ناشاد زندگانی سے
ایکوں کے دل گداز پانی سے

ایک کے پھول گل پہ نالے ہیں
ایک کی جان ہی کے لالے ہیں

ایک نے کوہ اس سے توڑ دیے
ایک تنکا کر اُن نے چھوڑ دیے

چپ لگی ہے کسو کو اس کے سبب
بندرہتے نہیں کسو کے لب

کوئی باتیں کرے ہے شوق کیساتھ
کوئی چپکا ہوا ہے ذوق کے ساتھ

ہے تو اجد کسو کو حال کہیں
کہیں نقصان ہے کمال کہیں

ایک محو لباس عریانی
ایک سر گرم دامن افشانی

کسو کو فکر کوئی ذاکر ہے
کوئی صابر ہے کوئی شاکر ہے

کہیں وسعت کہیں ہے تنگ اوقات
عشق کے ہینگے مختلف حالات

سیر قابل ہیں اس کے دیوانے
سننے کے گوں ہیں ان کے افسانے

وصل میں جن کے دل رہیں بیجا
فصل ہو تو انہوں کا حال ہو کیا

اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا
عاشق زار میرا نام ہوا

قصہ میرا بھی سانحہ ہے عجب
کس پہ گزرا ہے یہ ستم یہ غضب

معاملۂ اوّل

ایک صاحب سے جی لگا میرا — اُن کے عشووں نے دل ٹھگا میرا

ابتدا میں یہ رہی صحبت — نام سے اُن کے تھی مجھے الفت

خوبی اُن کی جو سب کہا کرتے — گوش میرے اُدھر رہا کرتے

بخت بر گشتہ پھر جو یار ہوئے — اک طرح مجھ سے دے دوچار ہوئے

کیا کہوں طرز دیکھنے کی آہ — دل جگر سے گزر گئی وہ نگاہ

چپکے منھ ان کا دیکھ رہتا میں — جی میں کیا کیا یہ کچھ نہ کہتا میں

دے تو ہر چند اپنے طور کے تھے — پر تصرف میں ایک اور کے تھے

بات کی طرز میری ہی بھاتی — میری آزردگی نہ خوش آتی

پیار چتون سے پھر نکلنے لگا — دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا

کہیں دیکھوں تو بات دیر کہیں — بیدماغ اور بیگمان رہیں

کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے — قسم اقسام مجھ سے لینے لگے

میں جو کھاتا قسم تو ہو برہم — کہنے لگتے کہ کیا گدا کی قسم

ایک دو دن میں بعد رفع ملال — لطف سے پوچھتے کہو کچھ حال

جو گزرتی تھی مجھ پہ میں کہتا — یا کوئی اشک آنکھ سے بہتا

دیکھ کر روتے آپ بھی روتے
دل دہی کرتے جبتلک سوتے

معاملۂ دوم

ایک مدّت تلک یہ صحبت تھی
کبھو اُلفت کبھو یہ کلفت تھی

رفتہ رفتہ سلوک بیچ آیا
ہاتھ پاؤں کو اپنے لگوایا

چلکر آتے تھے جب کبھو ایدھر
پاؤں رکھتے تے میری آنکھوں پر

دیکھنے میں تو پائمالی تھی
حسن سے چال یہ نہ خالی تھی

جلتی چھاتی تو ہوتا میں سائل
کہ ٹک اے سرو ہوادھر مائل

کفِ پا رکھیئے یاں تو احساں ہے
تیرے پاؤں تلے مری جاں ہے

ہنسکے سینے پہ پاؤں رکھ دیتے
دل مرا یوں بھی ہاتھ میں لیتے

کیا کہوں کیسا قد بالا ہے
قالب آرزو میں ڈھالا ہے

ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب
پیکر نازک اس کے سب محبوب

موئے سر ایسے جی بھی کریے نیاز
بل ہی کھایا کرے یہ عمر دراز

اس کے کاکل سے حرف سر نہ کرو
کاکل صبح پر نظر نہ کرو

کچھ بھی نسبت ہے تمکو سودا ہے
کالے کوسوں کی بات کیا ہے

اُسکی زلفوں کے دل گئے نہ پھرے
رہے سنبل کے پیچ پاچ دھرے

اُس جبیں سے ہے دل کی کب جاذب
صبح صادق کے دعوے ہیں کاذب

ویسی بھوئیں کشیدہ بھی ہیں کہیں
یہ کمانیں کسو سے کھنچتی نہیں

پھری پلکوں کی اور سب کی نگاہ
چشم پر میری تیری چشم سیاہ

کہوں چتوں کے دیکھنے کے طور
اس قیامت پہ وہ قیامت اور

سطحِ رخسار آئینے سے صاف
جو نہ ٹھہرے نگہ تو رکھیے معاف

لطف بینی کا فہم ہے دشوار
ایک باریک بینی ہے درکار

کیا جھمکتا ہے ہائے رنگ قبول — جیسے کھڑا گلاب کا سا پھول
ہے دہن تنگی سے سخن کوتاہ — کچھ نکلتی نہیں سخن کی راہ
اس سے گل کیا چنے کوئی ہمدم — غنچۂ ناشگفتہ سے بھی کم
برگ گل سے زباں ہے نازک تر — پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر
کیا کہوں کم ہیں ایسے شیریں گو — وہ زباں کاش میرے منھ میں ہو
دمبدم سوے گوش اشارہ صبح — گوہر گوش یا ستارہ صبح
جب بنا گوش ان نے دکھلایا — صبح کا ساسماں نظر آیا
ان لبوں کا مزالیا سو بھانت — تسکے اوپر ہمارا بھی ہے دانت
تم نہ گلبرگ ولعل ناب کہو — بات جب تک نہ ٹھہرے چپکے رہو
کوئی جاں بخش یوں کہے سو کہے — ہم تو مرتے ہی ان لبوں پہ رہے
کنج لب آرزوے جان و دل — آگے چلنا نگاہ کو مشکل
ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے — قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے
جو حلاوت انھوں کی کہیے اب — ہمدگر سے جدانہ ہو ویں لب
جب وے کھاتے ہیں بیڑۂ پاں کو — رونہیں دیتے لعل و مرجاں کو
ایسی ہوتی نہیں ہے سرخ لبی — رنگ گویا ٹپک پڑے گا ابھی
ہو تبسم سے لعل کا دل خون — ہنستے دیکھا تھا سو مجھے ہے جنوں
نہیں دیکھے مسی ملے دنداں — برق ابرسیہ ہے تب خنداں
کیسے کیسے چمکتی ہے بے تہہ — جگ ہنسائی کرے ہے اپنی یہ
بواگر کیجیے اس زنخ کا سیب — جائے سر سے جنون کا آسیب
رہے گردن میں ان کی میرا ہاتھ — یہ تو یارب ہے میرے جی کے ساتھ
بس چلے تو گلے لگا ہی رہوں — تیغ سے پھر جدا کریں تو نہ ہوں
اس میں ہر چند جی کا نقصاں ہے — مدعا اختلاط چسپاں ہے
خوش و پرکار کب پری ان سی — اور ہو تو کہاں ہے ہم جنسی

دیکھے ازبس بر آمدہ سینے ایسا معلوم دل جو یوں چھینے

کیا نظر گاہ کی کروں خوبی نظریں اُٹھتی نہیں یہ محبوبی

شانہ ودشت و ساعد بازو دل کشی میں تمام یک پہلو

اس کے تو پہلو سے میں ہو کے جدا درد پہلو سے تنگ دل ہی رہا

ہائے اُس سے خدا جدانہ کرے دور اس سے جیوں خدانہ کرے

یوں نہیں سرخ اس کی ہر انگشت ڈوبی ہیں میرے خون میں یکمشت

وہ کف وست راحت جاں ہے کاش سینے پہ رکھدے غم یاں ہے

کیا بیاں خوبی شکم کو کرے دیکھنے سے کبھو نہ پیٹ بھرے

صدر کے ناچیے سے لے تاناف چپ کی جاگہ ہے کیونکہ کہئے صاف

اس سے پھر آگے غنچہ گل ہے یاں سخن بابتِ تامل ہے

پردے میں بھی جو کچھ کہا جاوے آپ سے تو نہ ٹک رہا جاوے

گئی نظروں سے وہ کمر باریک ہو نہ آنکھوں میں کیوں جہاں تاریک

اور کیا دل زدے کو بات آوے کہیں یارب شتاب ہاتھ آوے

ناز کی اس میاں کی کیا کہئے بنے تو ہاتھوں میں لیے رہیئے

ٹک اگر لیجے تو قیامت ہے پھر قیامت تلک ندامت ہے

کیوں پڑی ران پر نظر تاساق اس بن اب زندگی ہوئی ہے شاق

پائے جاناں سے گفتگو ہے اب خاک میں ملنے کا یہی ہے ڈھب

وہ قدم کاش فرق سر پر ہو ساق سیمیں مری کمر پر ہو

وہ کفِ پا قریب ہو میرے ٹھوکر اس کی نصیب ہو میرے

پنڈلی نازک ہے شاخ سنبل کی پشت پاپنکھڑی سی ہے گل کی

یوں نصیبوں سے ہو حنا کا نانو ورنہ ڈوبے ہیں میرے خس سے پاؤں

ناخن پاحنائی ہیں ایسے برگ گل پاسے سرو ہوں ایسے

ہو خراماں تو اس طرف نگہیں گل کفش اُسکی لوگ دیکھ رہیں

گل و بلبل کبھی تماشائی آگے جسطرف بہار آئی
رنگ رفتار دیکھ مجنوں ہو طرز گفتار جیسے افسوں ہو
سرسے پاؤں تلک وہ محبوبی ساتھ ان خوبیوں کے یہ خوبی
کہ بہت دل ہے آشنائے رحم درد مندوں کو جانے جائے رحم
اب جو ثابت ہوئی ہے میری چاہ اس کو مدنظر ہے مجھ سے نباہ
طعن وتعریض بیچ میں آئے کچھ نہ خاطر میں وے مجھے لائے
راستے میں اک طرف وفا کے لئے چلے جاتے ہیں مجھ پہ لطف کیئے
نہیں آزار کی روا داری مہرورزی ہے یا وفاداری
پر جو معشوق آب وگل میں ہے چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہے
میں کروں تو کہیں خوش آتا ہے تیرا آزار جی سے بھاتا ہے
خواہ ناخواہ وہ نہیں منظور کہ رہے دل شدہ مرا رنجور
یہ بھی شوخی سے ہے گہے گا ہے پر اس انداز سے کہ جی چاہے

معاملۂ سوم

ایک دن فرش پر تھا میرا ہاتھ باتیں کرتے تھے وے بھی میرے ساتھ
پاؤں سے ایک انگلی مل ڈالی لطف سے درد وہ نہ تھا خالی
درد سے کی جو میں نے بیتابی دستِ نازک سے دیرتک دابی
یاد آتے ہیں ایسے لطف جواب گزرے ہیں جان غم زدہ پہ غضب
تن بدن دیکھ جی نہ رہتا تھا میں جو گستاخ ہو کے کہتا تھا
کہ یہ جاگہ تم اس فقیر کو دو متبسم ہو کہتے دے یہ لو
یہ بھی کیا کیا خیال رکھتے ہیں آرزوے محال رکھتے ہیں
پھر گھڑی بھر میں کہتے ہو نہ ملول مار کھانے کی باتیں سب ہیں قبول

جب سلوک ان کو یاد آتا ہے   کیا کہوں جی ہی بھول جاتا ہے

معاملۂ چہارم

ایک دن پان وے چباتے تھے   سرخ لب اُن کے مجھ کو بھاتے تھے
کہہ اُٹھا میں اگر اُگال مجھے   منھ سے دو تو کرو نہال مجھے
بولے یونہیں ہے میں کہا ہاں سچ   جھوٹا کھاتے ہیں میٹھے کی لالچ
ہنسکے اُس وقت مجھ کو ٹال دیا   پھر اُسی رنگ سے اُگال دیا
ایسی صدرنگ مہربانی تھی   تب سیہ روکی زندگانی تھی
اب کے سے رنگ گر فلک لاتا   خاک کے رنگ میں مجھے پاتا

معاملۂ پنجم

منقبت ایک مجھ سے کہوایا   جس کا میں نے صلہ انہیں پایا
پھر وہی کرتے ہیں جو کچھ کہتا   ایک پردہ سا بیچ میں رہتا
دوستی رابطہ وفا اخلاص   ساتھ میرے تھا اُن کو رابطہ خاص
میں تقاضائی ملنے کا رہتا   مختلط ہونے کو سدا کہتا
میری تسکیں تھی ہر زماں منظور   آپ بھی کرتے ملنے کا مذکور
وصل کے وعدے ہی رہا کرتے   آج کل رات دن کہا کرتے
دل تو تھا رحم آشنا ازبس   کڑھتے تھے جان کر مجھے بیکس
دیکھتے مجھ کو جو پریشاں دل   کہتے اے میر کچھ نہیں حاصل
دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہے کیا   جانے دے اب بھی یہ خیال ہے کیا

آفت جاں ہے دوستی کرنا | کب تلک گھٹ کے اس طرح مرنا
میں جو دیوانہ اُن کے روکا تھا | شیفتہ پیچدار موکا تھا
کچھ نہ سمجھی گئی کہن ان کی | اب جدائی جو ہے کٹھن اُن کی
یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں | وعدہ بن ہی ہلاک ہوتا ہوں

معاملۂ ششم

گلردوں بن جگر ہے داغ کباب | گیسوؤں بن ہے جی کو پیچ و تاب
صورت اُن کی خیال میں ہردم | خواب میں جو ہوں وہ مژہ باہم
میں تو بستر پہ دل شکستہ اُداس | چاند سا منہ انہوں کا تکیے پاس
میں بچھونے پہ بیخود و بیخواب | یک پیکر پری کا سا بخواب
فرش پر پاؤں یہ غبار آلود | ان میں وے دونوں پانگار آلود
جلتی آنکھوں کنے گل رخسار | جس پہ کچھ بکھرے موئے عنبربار
پاس منہ کے وے لالِ ترنازک | دست گستاخ پر کمر نازک
فرش اُس گلبدن سے سب بویا | پھول میں نے بچھائے تھے گویا
شب کٹی صورتِ خیالی سے | دن کو ہوں میں شکستہ حالی سے
گرچہ روزانہ بھی تصور تھا | لیکن اندوہ سے مکدر تھا
کہیں تصویر سی نظر آئی | کہیں منہ پھیر جیسے شرماتی
کبھی دل ان کے رودمومیں رہے | کبھی ملنے کی آرزو میں رہے
صورت خال اور کچھ ہردم | گاہ لب خشک گاہ مژگاں نم
میں بھی مقدور تک وفا کی ہے | جانِ غمناک پر جفا کی ہے
برسوں تک میں پھرا ہوں سرگرداں | روزوشب دونوں تھے مجھے یکساں
نے فقط جان سے جہاں سے گیا | زن وفرزندو خانماں سے گیا

کیچ پانی ہو مینھ ہو یا برسات — روز روشن ہو یا اندھیری رات
اُن تلک میرے تئیں پہونچ رہنا — بیٹھے منھ دیکھنا نہ کچھ کہنا
آشنا یار سارے بیگانے — کہ ہوئے میر جی تو دیوانے
رشتۂ ربط اُنھوں نے توڑ دیا — ملنا جلنا سبھوں نے چھوڑ دیا
نظر آتے نہیں ہیں مدت سے — انس پیدا کیا ہے وحشت سے
صبح ہوتے ہی گھر سے چلتے ہیں — جیسے کھوئے گئے نکلتے ہیں
چلے جاتے ہیں دیکھتے ہی راہ — پر کہیں کی کہیں پڑے ہے نگاہ
مل گیا جو کوئی تو بچ نکلے — سڑی خبطی دوانے بچ نکلے
شوق سے اُن کے حال دیگر گوں — پارہ پارہ دل وجگر شب خوں
رنگ ہر دم مزاج کا کچھ اور — کل کا کچھ اور آج کا کچھ اور
کیا بیاں کریے بیقراری کا — ذکر کیا حال اضطراری کا
جی پڑا ترے ساتھ سونے کو — دل پریشان جمع ہونے کو
پاس اُن کے رہوں تو دل کو قرار — پھر نہ ٹھہرے تنک ایک کریے ہزار
گئی برباد عزت اُن کے لئے — جلف لوگوں نے منھ پہ طعنے دیئے
گھورے پر سے جو اُٹھ نہ سکتے تھے — دے بھی کناس پوچ بکتے تھے
سفر آیا جو اُن کے تئیں درپیش — ساتھ اس رنج میں بھی تھا درویش
کیا کہوں جو اذیتیں دیکھیں — ہر قدم پر قیامتیں دیکھیں
جو پڑھے گا ننگ نامہ یاں — ہوگی ساری حقیقت اس پہ عیاں
یاں نہ تفصیل کرنے کا تھا مقام — کہ محبت سے یاں ہے حرف کلام

معاملہ ہفتم

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط — ہوسکا پھر نہ دوطرف سے ضبط

تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب　جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب
ایک دن ہم دے متصل بیٹھے　اپنے دلخواہ دونوں مل بیٹھے
شوق کا سب کہا قبول ہوا　یعنی مقصود دل حصول ہوا
واسطے جس کے تھا میں آوارہ　ہاتھ آئی مرے وہ مہ پارہ
گہہ گہے دست دی ہم آغوشی　ہمسری ہمکناری ہمدوشی
چند روز اس طرح رہی صحبت　پیار اخلاص رابطہ الفت
کچھ کہوں جو اُنہوں کی ہو تقصیر　نارسائی تھی طالعوں کی میر
ہوگئے بخت اپنے برگشتہ　پھر گیا آسماں نے سر گشتہ
بات ایسی ہی اتفاق پڑی　کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی
لگی کہنے کہ مصلحت ہے یہ　کتنے روزوں جدا تو مجھ سے رہ
یوں بھی آتا ہے عشق میں درپیش　کہ نشان بلاہوں اُلفت کیش
میں اُٹھایا نہیں ہے تجھ سے ہاتھ　گرچہ ہوںمت تو ہے میری جان کے ساتھ
اس جدائی کا مجھ کو بھی غم ہے　کیا کروں آبرو مقدم ہے
میں کہوں کیا مجھے نہ اپنا ہوش　جیسے تصویر سامنے خاموش
آنسو آنکھوں میں پرپیے جاؤں　دے کہیں کچھ تو ہاں کیے جاؤں
ان سے رخصت ہوئے جو بعد شام　تیرہ دیکھا جہاں کو ہر گام
دل ٹھہرتا نہ تھا ملالت تھی　جان کو رفتگی کی حالت تھی
یوں ہوا اُن کے کوچہ سے آنا　جیسے ہووے جہاں سے جانا
اب جو گھر میں ہوں تو فسردہ سا　چار پائی پہ ہوں تو مردہ سا
جی اُنہوں میں فسردہ قالب یاں　متحرک ہوگیا تن بیجاں
حال دل کا کہوں جو ہمدم ہو　کروں پیغام کچھ جو محرم ہو
جی میں کچھ آیا رو کے بیٹھ رہا　دل زدہ چپکا ہو کے بیٹھ رہا
کوئی آیا جو واں سے جی آیا　سو نہ آیا کبھی کبھی آیا

دیکھیے چندیوں رہیں گے جدا — چاہے ہے کیا ہمارے حق میں خدا

خون دل کب تلک پییں گے ہم — رنگ یہ ہے تو کیا جئیں گے ہم

آہ کیا کیا بیاں کروں خوبی — دل وہی حال پُرسی محبوبی

تند ہو کر نہ بات کو کہنا — ملتفت حالِ زار پر رہنا

لطف مبذول حال پر ہر آن — تازہ ہردم مروّت واحسان

لب سے جان بخش حرف سے دلجو — لطف سے پوچھنا کہ خوش ہے تو

یاد کرروؤں اُن کی کون سی بات — کس طرح کاٹوں ہجر کے اوقات

ملنا اُن سے ہو پھر گھٹے غم بھی — آئے جیتوں میں جایئے ہم بھی

مدّتِ ہجر اگر تمام ہوئی
ورنہ اپنی تو صبح شام ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی جوش عشق

ضبط کروں میں کب تک آہ اب — چل اے خامے بسم اللہ اب
کرتنک دل کاراز نہانی — ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میر اک خستۂ غم تھا — سرتاپا اندوہ والم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جاگہہ — بیخود ہوگئی جانِ آگہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت — تاب نے ڈھونڈھی اکدم فرصت
تاب و توان و شکیب و تحمل — رخصت اس سے ہوگئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی — بیتابی نے طاقت پائی
کرتے آئے داغ سیاہی — کام جگر کا کرنے تباہی
خون جگر ہو بہنے لاگا — پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب وخورش کا نام نہ آیا — ایک گھڑی آرام نہ پایا
چاک جگر سے محبت ٹپکی — آنسو کی جاگہہ حسرت ٹپکی
سوز سے چھاتی تابہ گویا — اور پلک خوں نابہ گویا
آہ سے اُس کی مشکل جینا — درد فقط تھا سارا سینا
دل میں تمنا داغ جگر میں — شیون لب پریاس نظر میں
نالے شکو اُس کے سن کر — مرگئے کتنے سر کو دھن کر
آہ وفغاں ہے اُس کے لب پر — روز ہے ابتک آفت سب پر

روئے وجبیں پہ خراش ناخن — داغوں سے خوں کے قیامت گلبن
زخم سینہ دل تک پہونچا — کوئی نہ اس گھائل تک پہونچا
آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا — فوارہ لوہو کا چھوٹا
غم نے تو دل میں کیا ہے چھوڑا — پر میں تھا اک پکا پھوڑا
سونہ گیا یکدم وہ بے کل — بخت نہ جاگے اس کے اک پل
کام رہا ناکامی ہی سے — تسکیں بے آرامی ہی سے
رخساروں پر خون رواں ہو — دل میں ہو سو منھ پہ عیاں ہو
دشنۂ غم سے سینہ کوچا — ناخن سے منھ سارا نوچا
دل آماجگہ غمناکی — اور نفس اک تیر خاکی
نے طاقت نے یارا اس کو — ضعفِ دلی نے مارا اُس کو
نالۂ دل میں حزینی اس کے — خاطر میں غمگینی اس کے
رنگ اُڑے چہرے کا ہردم — تھا گویا گل آخر موسم
دست بدل ہر آن رہے وہ — بیطاقت بے جان رہے وہ
خونباری سے چہرہ گلگوں — حلق بسمل دیدہ پرخوں
جدول جاری اک گریباں — گوشا دامن وقفِ مژگاں
دیدۂ ترکے دریا قائل — ساحل خشک لبی کے سائل
ہر دم ہو ہو سمت کو جاری — خوں باری سے سیل بہاری
تشنہ لبی اک منھ پر پیدا — لب چش جس کا ہو وے نہ دریا
خاک بسر آشفتہ سری سے — شور قیامت نوحہ گری سے
سرتاپا نہ آشفتہ دماغی — داغِ جنوں دے جسکو چراغی
غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا — جامے میں اک تار نہیں تھا
وادی پر جب اپنے آوے — صحرا صحرا خاک اڑاوے
کلفتِ دل جب خاک نشاں ہو — اشک کی جاگہ ریگ رواں ہو

گل اُن نے ازبسکہ کھائے   پھولوں کی چھڑیاں ہاتھ بنائے
دل کے غبارنے راہ جو پائی   شہر میں گویا آندھی آئی
سرپر اُس کے سنگ ہمیشہ   جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
آہ سرد کرے وہ عریاں   بید سا کانپے موئے پریشاں
گرد کی تہہ اس کا پیراہن   دامن صحرا جس کا دامن
بار دامن تار گریباں   دامن قرب جوار گریباں
پامالی میں مثل جادہ   نقش سر قدم ساخاک افتادہ
دشت تلک گئی آبلہ پائی   دور کھنچی اس کی رسوائی
اس کے جو پامال ہوئے سب   خار بیاباں لال ہوئے سب
جن نے دیکھا اس کو یکدم   ان نے کہا یہ بھول کے سب غم
چندے یہ ناشاد رہے گا   پرمدت تک یاد رہے گا
جلنا اس سے کرے نہ کنارہ   جیسے چراغ وقف بچارا
رکھتا سدا تھا وہ دیوانا   ورد زباں یہ شعر دانا
صار فوادی شقاً شقاً   حقاً حقاً حقاً حقاً
ہوش خرد ناشاد گئے سب   دین و دل برباد گئے سب
درد دل سے کچھ نہ کہے وہ   ہر اک کا منھ دیکھ رہے وہ
حسرت اس کی ایک اعجوبا   آب دہن کی موج میں ڈوبا
غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے   بات کہے تو اشاروں ہی سے
سمجھ تو کوئی داد کو پہونچو   عاشق کی فریاد کو پہونچو
ورنہ رہے من مار کر اپنا   سردے مارے ہار کر اپنا
کیونکر غم سے ہو آزادی   جان کے ساتھ اُسکی ناشادی
کوئی نہ اس پر سایہ گستر   اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر
نے کعبے نے دیر کے قابل   مذہب اس کا سیر کے قابل
کیسا کہیئے کیسا کچھ تھا   القصہ وہ ایسا کچھ تھا

در صفتِ دلبرے کہ با اوٗ علاقۂ دل بود

وہ کیسا تھا جس پر عاشق | جی سے تھا یہ عاشق صادق
دیدۂ گل میں جاگہ اس کی | نکہت گل گردِ رہ اُس کی
چشم برہ سارا چمن اُس کا | نقش قدم تھا یا سمن اُس کا
آگے اُس کے کبھو نہ آیا | یہ روگل نے کہاں سے پایا
گل آشفتہ اس کے روکا | سنبل اک زنجیری موکا
جب وہ چہرہ تابندہ ہو | ماہ دوہفتہ شرمندہ ہو
زلف اس چہرے پر تابندہ | کاکل صبح سے خوش آیندہ
دیکھ اس گل کی نور افشانی | شمع مجلس پانی پانی
ہو ہر چند یہ بدرِ کامل | اس چہرے کے ہو نہ مقابل
حوصلہ کتنا اُس بے تہہ کا | منھ دیکھو آئینہ مہ کا
رکھتی تھی دعوئ خوش چشمی پر | لیکن اُس کی چشم نظر کر
بہتوں کی جب جانیں گھل گئیں | نرگس کی بھی آنکھیں کھل گئیں
اور چشم ہے اُس کا جب سے | فتنہ اک سوتا نہیں تب سے
رخ لب سے جاں بخش عالم | بلکہ سراپا جان مجسم
عیسٰی کو گر لب دکھلاوے | ہر گز اس کو بات نہ آوے
کوئی مرد اندازِ حیا پر | چشم اس کی تھی پشتِ پا پر
کچھ مت پوچھو تنگی دہن کی | مشکل تھی واں جائے سخن کی
کر کے شمیم زلف گزارا | پھیلاوے ہے عنبر سارا
خط آیا ہے گرد اس لب کے | شاید شکر تنگ ہو اب کے

دونوں لب اُس کے لعل بدخشاں   دست حنائی پنجۂ مرجاں
تھا دیکھا یکرہ پردے میں   برق خرمن مہ پردے میں
جسدم برقع منھ سے اُٹھاتا   خورشید اُس دم ڈوبا جاتا
پار دلوں کے خدنگ مژہ کا   کاوش کم کم تنگ مژہ کا
بھوں کی کشش کادوانہ عالم   تیرنگہ کا نشانہ عالم
تیغ و تبر تھی ابرو اُس کی   آتش سرکش جو تھی اس کی
ناز کی مے سے مست رہے وہ   اکثر دست بدست رہے وہ
زلفوں کے سب تار پریشاں   سراوپر دستار پریشاں
سایہ سے اس کے سرو بنایا   خاک رہی سے تدرو بنایا
ہووہ خراماں جب وہ کافر   کبک کی ہووے جان مسافر
چشم کرشمہ جان تغافل   شایاں اُس کی شانِ تغافل
کیا جانے وہ حال کسو کا   پتھردل اُس آئینہ روکا
پاتے ہی ابرو کا اشارا   غمزے نے اک خنجر مارا
جب وہ خرام ناز کرے ہے   جی کو جور نیاز کرے ہے
رخصت دے گرعشوہ گری کو   ایک ہی جلوہ بس ہے پری کو
ہنسنے میں وہ صفائے دنداں   برق خرمن عالم امکاں
رشکِ سحر کو صافی تن پر   خونِ صراحی اُس گردن پر
آہ صفائی اُس سینے کی   غیرت افزا آئینے کی
شکل چیں میں یہ ناز کہاں ہے   صورت ہے انداز کہاں ہے
ایسا خوب جہاں میں کہیں ہے   رحم ہے اسپراب جو نہیں ہے
جب وہ شکل نظرآتی تھی   کلفت دل کی نکل جاتی تھی
رنگیں اس کی اس کف پا سے   جائیں نہ کیوں یاں اپنی جا سے
چشم کرو انصاف کی گروا   یوسف وشیریں لیلیٰ عذرا

کون ہوا اس محبوبی سے　　خوبی تھی پر اس خوبی سے
بار نزاکت کیونکہ اٹھاوے　　شاخ گل سا لہکا جاوے
ہے گی رگ گل یا رگ جاں ہے　　پر نازک اسرار میاں ہے
صید ملک قربانی اُس کا　　یوسف اک زندانی اُس کا
اور جو خوباں پاویں اُس کو　　یکدیگر دکھلاویں اُس کو
جاویں اس پر جان سبھوں کی　　تیغ رہے درمیاں سبھوں کی
تھانبا جائے کس کے کنے وہ　　غصے ہو تو پھر نہ منے وہ
کیا کوئی شوخی اُس کی بتاوے　　کچھ ٹھہرے تو کہنے میں آوے
کیا ہے اُس کے آب و گل میں　　آرزو اس کی سب کے دل میں
سب کو میل اُس بت کی ادا کا　　بندہ کون رہا ہے خدا کا
دیکھے نہ عاشق زار کو اپنے　　پوچھے نہ وہ بیمار کو اپنے
عاشق ظلم و جور و جفا کا　　دشمن جانی اہل وفا کا
کوچہ رشک فزائے کعبہ　　واں پہونچے نہ دعائے کعبہ
ہر شب اک فریاد و تظلم　　اُٹھ گئی واں سے رسم ترحم
آہیں جن کی درد وظائف　　سو دل خستے واں کے طائف

رخصت شدہ رفتن یار و بیتاب شدن عاشق بیقرار

کرائے خامہ وہ تحریر اب　　آوے زباں پر جو تقریر اب
یعنی میر اُس خستہ غم کا　　سرتاپا اندوہ والم کا
بارے سفر کا مائل ہوکر　　حبّ وطن کو جی سے دھوکر
رخصت کو اس پاس بھی آیا　　جلتے کے تئیں اور جلایا
وقتِ وداع قیامت گزرا　　سر سے آب حسرت گزرا

اک دم بیخود ہو کے رہا وہ　　اس سے آگے آپ گیا وہ
آنکھیں لگیں ناسور ہو بہنے　　دیکھ اس گل کو لگا یہ کہنے
ظلم ہے لو ہو پیتے رہیئے　　جان گئے پر جیتے رہیئے
عمر عزیز چلی یوں جاوے　　اور فلک آنکھوں سے دکھاوے
آخر کر کے خدا کے حوالا　　آئینے پر پانی ڈالا
تا کہ رو دکھلاوے شتابی　　راہِ دور سے آوے شتابی

یار گئے پر میر جواب ہے
جان سے خالی اک قالب ہے

راقم غم ہے وہ دل تفتہ　　نامہ بر اس کا رنگ رفتہ
غم سے فرصت اُس کو کہاں ہے　　قاصد اشک ہمیشہ رواں ہے
خط لکھتا ہے اس مضموں سے　　تر ہو بال کبوتر خوں سے
خط سے اک آتش پر ہووے　　جس سے کباب کبوتر ہو وے
جب دردِ دل اُن نے لکھا ہے　　شعلہ خط میں لپیٹ دیا ہے
سوز کے آوے جب وہ بیان پر　　شعلہ اک جوں شمع زباں پر
جب کرے خونِ جگر سے انشا　　یار کا اپنے شوق کفِ پا
ہو انگشت بُریدہ خامہ　　اور حنائی کاغذ نامہ
راہ پہ بیٹھا وہ سرگشتہ　　دیکھے راہِ عمرِ گزشتہ
آگے تھا کب ہجراں دیدہ　　آہ وہ تازہ ظلم رسیدہ
کیا کیا بے طاقت ہوتا ہے　　ہردم جی رخصت ہوتا ہے
حال عجب ہے رنجوری سے　　مرنے قریب ہے وہ دوری سے
جب وہ دردِ دل کو جتاوے　　باتوں پر اس کے رونا آوے
دستہ دستہ داغ بسر ہے　　پر کالہ پرکالہ جگر ہے
اشک نہیں آنکھوں سے ٹپکتا　　ہے یہ گرہ اک دل کی تمنا

داغ دردِل ہے گلشن گلشن گل یہ چنے وہ دامن دامن

چھوڑے نہ راہ رسمِ وفا کو دے پیغام ہمیشہ صبا کو

پاس اس کے گر تیرا ہو جانا بھولوں ہوؤں کو یاد دلانا

زیرِ لب اس کے بات یہی ہے شام سحر دن رات یہی ہے

کھینچیں گے کب تک یہ سختی ہم پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم

بس اے خامہ رکھ لے زباں کو تاب نہیں ہے اہلِ جہاں کو

قصہ غم کو نہایت کب ہے

اس سے خموشی اب انسب ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی اعجازِ عشق

ثنائے جہاں آفریں ہے محال
زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال

کمالات اُس کے سب پر عیاں
کرے کوئی حمد اس کی سو کیا بیاں

کہوں کیا میں اس کی صفات کمال
کہ ہے عقلِ یاں پریشاں خیال

خرد کنہ میں اس کی حیران ہے
گماں یاں پریشاں پشیمان ہے

زمین وفلک سب ہیں اس کے حضور
مہہ وخور ہیں اس سے ہی لبریز نور

یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے
کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے

نہ آوے کسی کے جو ادراک میں
سو رکھ جائے وہ اس کف خاک میں

بری ہے گا تمثیل وتشبیہ سے
منزہ ہے وہ بلکہ تنزیہ سے

سفید وسیہ کو نہیں اُس کی بار
ورے ہے زمانے کی لیل و نہار

وہی حاصل مزرع آسماں
کئے ان نے دانے میں خرمن نہاں

در توحید انشا طراز حسینے کہ فقرۂ یکتائی او بعالم دویدہ

سوا اس کے نقصاں ہے گر دیکھئے
کمال اس کے ہی ہیں جدھر دیکھئے

سر رشتۂ ہو خلق کا اس کے ہاتھ
وہ شب باز ان پتلیوں کے ہی ساتھ

سبھوں میں نمود اُس کی ہی شان ہے
یہ قالب ہیں سارے وہی جان ہے

گل و غنچۂ ورنگ وبوئے بہار
یہ سب رنگ اللہ ہی کہ ہیں یار

اگرچہ سبھوں کی ہیں طرحیں جدا
یہ سب طرحیں ہیں ایک نام خدا

سما ارض و خورشید یا ماہ ہے
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے

نظر کر کے ٹک دیکھو ہر جا ہے وہ — نہان وعیاں سب میں پیدا ہے وہ
بہر صورت آئینہ ہے گا جہاں — یہ سب عکس اس کے ہی پڑتے ہیں یاں
ملک جن وحیواں جماد ونبات — جو اس بن ہیں تو حیف ہے کائنات
وجود وعدم اس سے دونوں ہیں شاد — وہی ہے گا مبدا وہی ہے معاد
مجھے ساقی دے کوئی جام عقیق — ولیکن لبالب ہو اس میں رحیق
رکھے آپ میں جس کی آمد مجھے — کہ درپیش ہے نعت احمدؐ مجھے

در نعت سیّد المرسلینؐ

ثنا جانِ پاک محمدؐ کے تئیں — درود تحیات احمدؐ کے تئیں
رسولِ خدا و سرِ انبیا — زہے حشمت وجاہ صلِّ علیٰ
دیا مجلس کبریا کا ہے وہ — شرف دودمان قضا کا ہے وہ
سب اس صفحے میں ظہورِ خدا — پر اس سے عبارت ہے نورِ خدا
جہاں وہ ہے واں جبرئیل امیں — اُڑے حشر تک تو پہنچا نہیں
کروں اس کی قربت کا کیا میں بیاں — کہ تھا قاب قوسین ادنیٰ مکاں
میرا زیر پا اس کے فرقِ نیاز — کیا جس کی خلقت پہ صانع نے ناز
بصورت اگر عبد مشہود ہے — حقیقت کو پہونچو تو معبود ہے
نہیں پا شکستوں کا اب دستگیر — محمدؐ بن اور آل بن اس کے میر
گنہگار ہوں چشم ایک اس سے ہے — توقع شفاعت کی ایک اس سے ہے
درود آل پر اس کے ہر صبح وشام — وہ ہے شافع حشر و خیرالانام
پلا ساقیا بادۂ لعل گوں — کہ ہو جائیں سرخ آنکھیں مانند خوں
ہے اب حرف مستانہ کا دلمیں جوش — کر آویزۂ گوش گر کچھ ہے ہوش

مناجات بطور عاشقانِ زار در بلائے جدائی گرفتار

مرا زخم یارب نمایاں رہے
پس از مرگ صد سال خنداں رہے

رہے دشمنی حبیب سے چاک کو
صبا دوست رکھے مری خاک کو

مژہ اشک خونیں سے سازش کرے
غمِ دل بھی مجھ پر نوازش کرے

جگر ہے طپیدن موافق رہے
مرا درد دل مجھ پہ عاشق رہے

جو نالہ ہو شبگیر کا روشناس
وہ آٹھوں پہر ہی رہے میرے پاس

مژہ گرم افسوس ونمناک ہو
کہ سیلاب آتش پہ خاشاک ہو

کرے نیزہ بازی یہ آہ سحر
کہ خورشید کی پھوٹ جاوے سپر

خموشی سے مجھ کو رہے گفتگو
اُڑے پر لگاکر مرا رنگ رو

نہ مرہم سے افسردہ ہو داغ دل
شگفتہ رہے یہ گلِ باغ دل

سدا چشم حیرت سے نسبت رہے
مجھے دیکھ رہنے کی فرصت رہے

اگر ضعف تک کسب طاقت کرے
مری ناتوانی قیامت کرے

مری بیکسی ناز بردار ہو
مروں میں تو مرنے کو تیار ہو

بیاباں میں آشفتہ حالی کروں
کہیں تو دل پر کو خالی کروں

کریں دونوں عالم ملامت مجھے
ڈبو دیوے اشک ندامت مجھے

مرا ہاتھ ہو چاک کا دستیار
کہ تاجیب دامن ہو قرب وجوار

جنوں میرے سر پر سلامت رہے
بیاباں میں مجھ سے قیامت رہے

بھٹکنے سے مجھ کو نہ ہو وار ہی
بھلا دے خضر کو میری گمرہی

جو ہو گرم رہ پائے پُر آبلہ
تو ہوجائے سرد آتشِ قافلہ

ارے ساقی اے غیرتِ آفتاب
کہاں تک ہمیں خونِ دل کی شراب

کبھو ساغرِ بادہ کا دید ہو
محترم ہمارا کبھو عید ہو

در تعریف عشق خانماں آباد آزادگاں برنانہاد

رہے عشق نیرنگ سازی تیری
کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری

تجھی سے ہے آبِ رخِ زرد زرد
تجھی سے مرے دل میں اُٹھتا ہے درد

تجھے ربط کفار و دیندار سے
تجھے رشتہ تسبیح وزنار سے

تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری
تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری

ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے
ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے

تجھی سے دلِ شاد غمناک ہے
تجھی سے مرا سینہ صد چاک ہے

تمنا کو تونے کیا ہے شہید
تجھی سے نہ بر آئی میری اُمید

تجھی سے مجنون صحرا نورد
تجھی سے ہے فرہاد کو ہوں پہ مرد

تجھی سے گلو بند ہے خستگی
تجھی سے ہے وابستہ دل بستگی

تجھی سے دل عاشقاں ہے کباب
تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب

تیرا کام دینا ہے بدنامیاں
تیری رنجھ دیکھی ہے ناکامیاں

تجھی سے سراسیمہ ہیں یار لوگ
تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ

تجھی میں ہیں یہ کارپردازیاں
تجھی پر ہیں موقوف جانبازیاں

مجھے اس کے چھپنے کا سودا رہا
ولیکن تیرا راز رسوا رہا

لہو اپنا عاشق پیا ہی کیے
ترے جرم پر جی دیا ہی کیے

تیرا ہی نمک خوار ہے زخم دل
کہ مرہم سے بیزار ہے زخم دل

تجھی اک ہی مژگاں سے یہ ربط اشک
کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبط اشک

کدھر ہے تو اے ساقی لالہ فام
نہ لغزش ہے تجھ کہ بہکا کلام

کہاں تک کوئی خونِ دل کو پیے
کوئی کیونکہ اس رنگ ظالم جیے

زبانی درویش جگر ریش کہ ایں بلا در سر آمد

کسو معتبر سے روایت ہے اک
کہ درویش سے یہ حکایت ہے اک

کہ اک ملک میں میں قضارا گیا
جواں ایک واں مفت مارا گیا

وہ جس طور مارا گیا اب کہوں
تعجب ہے اس کے کہاں تک رہوں

سُن اب آجو کچھ اس کے جی پر ہوا
مصیبت زدہ بن اجل ہی موا

اُٹھا سیر کرنے کو میں ایک روز
پشیمانی اس کی ہے مجھکو ہنوز

نظر جا پڑی جو مری ایک سو
سرِ راہ بیٹھا تھا اک خوبرو

فقیروں کی سی جھولی ایک اس کے پاس
بدن میں نہایت مکلف لباس

سر اوپر تھا ہنگامہ اک اس کے جمع
پتنگے اکٹھے ہوں جوں گرد شمع

لقب اس کا دیوانۂ عشق تھا
کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا

جوانی کے گلشن کا وہ تازہ گل
کرے جس کی خاک قدم غازہ گل

اُسی کی سی مقدور تک سب کہیں
سدا اس کا منہ دیکھتے ہی رہیں

وہ اک دود ماں کا تھا روشن چراغ
جلاتے تھے سارے اُسی پر دماغ

دلے اس کے دل میں اک آتش نہاں
کہ دیکھے جلا اس سے سارا جہاں

سب آرام چاہیں اسے اضطرار
سراپا تلک ایک دل بیقرار

نہ کچھ ہوش گھر جانے کا اس کو تھا
تشتت نہ مرجانے کا اس کو تھا

نہ طاقت تھی تن میں نہ کچھ جی میں تاب
نہ دل پاس نے صبر و آرام و خواب

سرراہ دل قیمہ قیمہ لیے
یہ کہتا تھا مرجایئے بس جیے

سن اس نوگلِ عشق کی بیکلی
رہا کرتی ماتم سرا وہ گلی

دل وصبر وہوش وتوان وحواس	رہیں اس کی وحشت سے سارے اُداس
نہ مانوس کا ننگ نے نام کا	بلا دوست دشمن تھا آرام کا
شب وروز فریاد کرنا اُسے	کئی بار اک دم میں مرنا اُسے
تماشے کا دیوانہ پیدا ہوا	زمانے چندے تماشا ہوا
جو دم لے طپش تو شتابی کرے	تسلی دل کی خرابی کرے
کرے طرح داغوں سے وہ باغ کو	روانی اُسی سے زر داغ کو
دل غمزدہ سے محبت اسے	قیامت خوشی سے عداوت اُسے
وہ بیتابیوں سے بہت کم فراغ	کہاں صبر کرنے کا اس کو دماغ
اٹھی اس کے جی سے فغاں کی شرر	وہی برچھیاں سہتی آہِ سحر
وہ ہر چند ہر صبح کو ہو ملول	ولیکن دعا اس کی کیا ہو قبول
نہ آنسو کو اس کے تھی اس پر نظر	نہ آہ سحر میں تھا اُس کے اثر
کہے رنگ رو کیوں مرا زرد ہے	رکھے ہاتھ دل پر کہ کچھ درد ہے
کرے دیدۂ اشک افشاں پہ ناز	بدے لختِ دل رونے کیا کچھ نیاز
وہ کاندھے پہ نعش تمنا کے تئیں	کرے تعزیت خانہ دنیا کے تئیں
سُنے نہ کسو کی نہ اپنی کہے	بیاں اس کا کچھ گو مگو ہی رہے
لے آساقی گرباده کا شوق ہے	یہ مستی کا ہم کو بھی ذوق ہے
کھلا چاہتا ہے گلِ رازِ عشق	کہ پردے میں کبتک بجے سازِ عشق

رفتن درویش پیش آں جوان رفتہ از خویش وولدہی کردن او بیش از بیش

یہ قصہ جہاں میں فسانہ ہوا	مجھے بھی سخن کا بہانہ ہوا

ولے گاہ وہ شمعِ مجلس فروز — کئی بیتیں پڑھتا تھا وہ سینہ سوز

کہ جن کا یہ مضمون تھا دوستاں — جلے ہیگی تقریر کرتے زباں

بڑی آتش عشق سرکش ہے یاں — جگر کیوں نہ جلجائے آتش ہے یاں

نظر آکہیں جارہا ہے یہ جی — کہ آنکھوں میں اب آرہا ہے یہ جی

زن ومرد کی ہوں زباں سے تبنگ — ہوا ہوں میں سارے قبیلے کا ننگ

سدا خونِ دل میں طپیدہ ہوں میں — کہ آہ بلب نارسیدہ ہوں میں

تیری دوری میں پہنچی ہے اے حبیب — وداعِ دمِ واپسیں بھی قریب

جگر تو ہو پانی بہا غم کے بیچ — یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ

سمجھنا یہ بھی اے مرے سرپہ خاک — کس امید پر میں ہوا ہوں ہلاک

تو جب سے در اوپر نظر آگئی — رہیں آفتیں میرے سر پر نئی

نہ نامہ نہ پیغام نے رسم وراہ — یونہیں ہوتی جاتی ہے حالت تباہ

دل ودیدہ سب مدعی ہوگئے — تماشائی مجھ پر بہت رو گئے

کئی بار جاں لب پر آپھر گئی — کہاں ہے تو اے گل ہوا پھر گئی

یہ حیران ہوں صبر آتا نہیں — تصوّر ترا جی سے جاتا نہیں

خراشِ جگر سے ہے چھاتی میں درد — کہ جس سے ہوا جائے ہے رنگ زرد

رہا کرتی ہے داد بیدادیاں — دلِ شب سے گزرے ہے فریادیاں

سر رہ تک آدیکھ یہ خستہ حال — کہ ہے نقشِ پا کی طرح پائمال

تیرے دورِ غم میں تو جوں کیمیا — سُنا ہی گیا نام مہر ووفا

نہ آنا نظر ہی ادا ہے ولیک — نہ اتنا کہ جاتا رہے جی سے ایک

تیرے غم میں اے آفتِ روزگار — ہزاروں بلائیں ہیں یاں روبکار

کہاں ہے تو محمل نشینِ حیا — سرِ راہ نالاں تھا مثلِ درا

کہہ اس طرز سے حالِ دل کا تمام — خموشی کو پھر اس نے فرمایا کام

کہاں ہے تو اے ساقیِ گلعذار — کہ دے مجھ کو جامِ مے خوشگوار

لکھوں قصۂ عشق بے کیف وکم — قلم بیخودانہ کرے کچھ رقم

مجھے آہ اک اس کے دل کی لگی — کہے تو کہ سینے میں برچھی لگی

گیا زہرۂ تاب دل آب ہو — کہا آگے جاکر میں بیتاب ہو

کہ اے ناز پروردۂ مہرووفا — کوئی اپنے جی پر کرے ہے جفا

مثل ہے کہ جی یہ تو ہے گا جہاں — وگرنہ موئے پر ہے کیا میری جاں

تکلف یوں نہیں جان کرتا کوئی — نہیں اس سلیقے سے مرتا کوئی

تہہ دل ہو معلوم تابول ٹک — تو مژگاں خوں بستہ کو کھول ٹک

سخن حسرت آلود کہنے پہ آ — کچھ اک دل کی باتیں زباں پر بھی لا

وگرنہ تو رُک رُک کے مرجائے گا — یہ ہے عشق کام اپنا کرجائے گا

تو ہے صرصرِ غم سے آتش بجان — دیا سانہ بجھ جائیو اے جوان

تو اے شمعِ خامش زباں ٹک ہلا — کہ کس مجلس افروز سے تو جلا

تو کس آتشِ تند پر ہے سپند — ترا دردِ دل یہ ہوا ہے بلند

جلاتی ہے آتش تری میرے تئیں — کیا داغ کس شعلے نے تیرے تئیں

گھٹاپاتے ہیں تجھ کو ہر صبح وشام — نہ کاہیدہ ہو تو ہے ماہِ تمام

ترا درد پنہاں ہے گو آشکار — یہ مجھ سے بیاں کر کہ ہوں راز دار

کہیں دل لگا ہو تو یہ مجھ سے کہہ — کہوں اس سے جاکر غمیں تو نہ رہ

جہاں کو تو بھیجے وہاں جاؤں میں — کہے کام جو بجالاؤں میں

جو حورِ بہشتی بھی ہو تیری یار — کروں میں ملک کی طرح واں گزار

خدا جانے کیا جی میں بات آگئی — کہ یہ میری دلجوئی ہی بھاگئی

یہ سن کر جوانِ زخود رفتہ نے　　جگر سوختہ اور دل تفتہ نے

کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود　　زباں تاب کھانے لگی جیسے دود

سخن ہونے لاگے نمودار کچھ　　لگا کرنے پیچیدہ گفتار کچھ

کہ جس سے یہ معنی ہوئے مستفاد　　کہ اے غمگسارِ دلِ نامراد

جو دلجوئی میری ہے مدِّ نظر　　تو یاں اک محلّہ ہے ٹک قصد کر

نہیں اس کو درکار کچھ جستجو　　سرا ایک ترسا کی ہے قبلہ رو

زبانی میری درپہ یہ جاکے کہہ　　کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ

تیرے واسطے خوب رسوا ہوا　　میرے سرپہ ہنگامہ برپا ہوا

تسلّی شکیبائی مطلق نہیں　　پر اب تابِ تنہائی مطلق نہیں

رہی جب تلک تن میں تاب وتواں　　اُٹھایا تحمّل کا بارِ گراں

شتابی سے دے ساقیا جامِ عشق　　کہ لکھنے لگا ہوں میں پیغامِ عشق

ہوا آخر اب دل کا سب خونِ ناب　　پیوں کب تلک اک گلابی شراب

کہے سے جواں کے غرض قصد کر　　گیا بندہ ترسا کے دروازے پر

سُن آواز دستک کی اک شبکِ حور　　مہ چار دہ سی نپٹ باشعور

دوچار آگے مجھ سے ہوئی ایکبار　　گیا جس کے دیکھے سے صبر وقرار

ہوئی دیکھے سے جب حقیت عیاں　　کہا میں کہ تاجر پسر تھا جہاں

بشر کیا کہ دیکھ ایسی آفت کے تئیں　　فرشتہ بھی رو بیٹھے عصمت کے تئیں

کہا میں نے پیغام جو آیا بن　　یہ خوبی سے اس کی کروں کیا سخن

مژہ بجنت عاش کی برگشتگی　　نگہہ ایک عالم کی سرگشتگی

قدوقامت اس کا کروں کیا بیاں　　قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں

وہ نازاں جدھر آتی تھی اچپلی　　قیامت بھی آتی جلو میں چلی

میں سودائی اس زلف تاریک کا
ہر اک موسبب رنج باریک کا

شکن اس کی کاکل کا دام بلا
ہر اک حلقۂ زلف کامِ بلا

بھوؤں کی کمانوں سے لگ زلف تار
الٹتے تھے اُڑ اُڑ کے جوں تیز تار

اگر ابرو اس کی جھمک جاتی تھی
مہِ نو کی گردن ڈھلک جاتی تھی

ہلے اس کے ابرو جدھر کرکے ناز
کرے اس طرف ایک عالم نماز

کمان اس کے ابرو کی عاشق مکیں
خدنگ اس کے مژگاں کی سب دلنشیں

نہ آنکھوں کی مستی کی اس کو خبر
خرابی نہ عاشق کی مدِ نظر

نگہدار تھی سُرخی چشم کی
طرفدار تھی اپنے ہی خشم کی

شہید اس کی چشمک کے دل خستگاں
نشانے نگاہوں کے دل بستگاں

مژہ موجب قتل جمع کثیر
غرض سب تھے یہ ایک ترکش کے تیر

چھپیں اس کے غمزے میں کتنی سناں
نمایاں ہوئے سب پہ مرگ جہاں

جبیں کھولدی اس پریزاد نے
کہ چیں مانی خوبانِ نوشاد نے

رواں اس شب افروز سے اشک شمع
یہیں سے ہے روشن کہ تھی رشک شمع

وہ مردوں کو زندہ دوبارہ کرے
مسیحا جہاں سے کنارا کرے

پری منفعل رنگ رخسار سے
خجل کبک انداز رفتار سے

خضر تشنہ اس کے ہے دیدار کا
مسیحا شہید اس کے بیمار کا

سوا اس کی باتوں کے سب باتیں ہیں
جسے سن کے مردے بھی جی جاتے ہیں

غرض اور سب یوں نہیں کہنے کو ہیں
مسیحا کے لب یونہیں کہنے کو ہیں

لب سُرخ اس کے وہ گلبرگ تر
چھپیں جن میں دنداں کے سلک گہر

تبسم میں اپنے وہ برق بہار
دم حرف ہوتے گئے آبدار

دہن غنچۂ ناشگفتہ سے ۔ کم
سخن رہروراہ تنگ عدم

تبسم تنگ گردہ دلکش کرے — تو گلشن میں گل صد چمن غش کرے

نہ دیکھا کسی نے جو تن اس کا صاف — نظر گر نہ ٹھہرے تو کیجئے معاف

کمر اس کی ممکن نہیں ہاتھ آئے — مگر صاحب دستِ غیب اُس کو پائے

نہ رنگ صفا ہی فقط تن پہ تھا — کہ مینا کا خون اس کی گردن پہ تھا

کیا اس نے پامال فتنوں کا خون — حنا اس کے ہاتھوں میں کتنوں کا خون

ادا اس کی عاشق کے جی کی بلا — نہ میری تمھاری سبھی کی بلا

اگر جلوہ گر ہو وہ محشر خرام — تو معلوم ہے پھر جہاں کا قیام

خراماں خراماں جدھر آگئی — قیامت ہی گویا اُدھر آگئی

اُسے لغزشِ پامئے ناز سے — وہ مستِ سرانداز انداز سے

نہ ہووے وہ دن جس میں ہووے نقاب — چلا جائے پردے ہی میں آفتاب

اُسی بت کا ہراک تئیں ذکر ہے — خدا کو خدائی کی اب فکر ہے

چڑھا دے اگر ہاتھ سے آستیں — تو پھر دستِ موسیٰ بھی کچھ ہے نہیں

ہوئیں طرح اس سے جفاکاریاں — نکالی ہیں اُن نے دل آزاریاں

ترحم کو پاؤں تلے وہ ملے — ستم اس کے کوچے سے بچکر چلے

جو آمد ہو اس کی نصیبِ چمن — کرے ترک گل عندلیب چمن

گلی اس کی فردوس کا تھی شرف — بہشت اِک گنہگار سی اک طرف

زمین اس کی یکدست گلزار تھی — نسیمِ چمن واں گرفتار تھی

گلی اس کی وہ قتل گاہ عجیب — شہادت جہاں خضر کو ہو نصیب

وہی جائے باشِ دلِ عاشقاں — اسی پر معاشِ دلِ عاشقاں

صبا گر اُڑا دے تنک واں کی خاک — تو نکلے زمین سے دلِ چاک چاک

کئی نعرہ کش واں کئی نعرہ زن — کئی خوں گرفتہ کئی بے کفن

کئی بے وطن واں سفر کر گئے سسکتے ہیں کتنے کئی مر گئے

ہر اک جان ہر شخص ناکام کی ہوا وار اس کے لب بام کی

پھروں گرد ساقی نشے میں تیرے گلابی ہی منہ کو لگادے مرے

مجھے مست آب یہ دیکھ کر چلوں جوں قلم پھر بھی مطلب اوپر

سُنا وہ جگر سوز پیغام جب کئے آشنا حرف سے لعل لب

پڑھی اک رُباعی یہ کر اعتبار کہ مضمون جس کا یہ موزوں ہے یار

کہ ہجراں میں جو بیقراری کرے سرِ راہ فریاد وزاری کرے

نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو بھلی مرگ ایسے فرد مایہ کو

محبت کی رہ میں یہ پہلا ہے کام کہ سر سے گزر جایئے شاد کام

نہیں شرط اُلفت میں چینِ جبیں اگر پیش آوے دمِ واپسیں

جو پھوٹا ہی پڑتا ہو جوں آبلہ وہ ہے دم میں واماندۂ قافلہ

نہ ہو جو سکے ہجر کا پائمال تو بہتر ہے ہونا ہی اس کا وصال

گیا میں جواب اس سے لے کر ادھر سرِ راہ تھا پامالِ غم وہ جدھر

حقیقت بیاں کی سب اس جائے کی جواں نے یہ سُنتے ہی اک ہائے کی

گئی ساتھ اس ہائے کے اس کی جان گرا خاک پر ہوکے بیدم جوان

تکے تھا مگر رہ سفر کر گیا کہ اک بات کی بات میں مر گیا

یہ دیر اس کو ہوتے ہوئے جی سے سیر مجھے بات کے کہتے لاگی بھی دیر

میری بات میں خون بلبل ہوا دیا سادہ جلتا جو تھا گل ہوا

میں یہ واقعہ دیکھ گھبرا گیا کہ یوں یہ گل تازہ مرجھا گیا

نہ سوجھا مجھے اور کچھ اس کے سوا کہ کریے بیاں طرف ثانی سے جا

ملامت کروں اس کو میں اک جہاں کہ اے بے حقیقت گئی اس کی جان

رہی گھر میں خوبی پہ تجھ کو نظر — سرِ رہ گیا ایک جی سے گزر
کفِ خاک اس کی ہی ذلت کا باب — تیری آستاں بن یہ ہے گی خراب
یہ ٹھہرا ادھر میں روانہ ہوا — اُدھر مرنا اس کا فسانہ ہوا
پلا ساقیِ ماہ وش ایک جام — گیا کاستن ہی میں ماہ تمام
کہا ہے وہ خونِ کبوتر سی مئے — کہ پی کر فغاں کیجئے مثلِ نے
غرض جوں توں کر قطع میں راہ کی — گیا تھا جہاں منزل اس ماہ کی
کی آواز دستک کہ بارِ دگر — ہوئی گھر میں القصہ میری خبر
درخانہ پر آئی پیرزن — لگی کرنے عشق جواں سے سخن
کہ کیوں دوسری بار آیا ہے تو — شگوفہ مگر اور لایا ہے تو
کوئی رہ گیا تھا پیامِ جواں — جو تو پھر شتابی سے آیا یہاں
بیان کرجو کہنا ہو تجھ کو شتاب — کہ ہے منتظر غیرتِ آفتاب
کہا میں نے اسے پیرزن کیا کہوں — عزادار اس نوجواں کا میں ہوں
پیام اُس کا لیا تھا میں اس لیے — کہ وہ بے اجل مرتا ہے ٹک جیے
سو یاں سے گیا ایسا لے کر جواب — کہ جس سے نکلتا تھا ناز وعتاب
نہ تھی تاب حرف درشت اس کے تئیں — گیا غم نے تھا نیم کشت اُس کے تئیں
نہ مشغول یونہیں وہ زاری سے تھا — وہ بیتاب بے اختیاری سے تھا
نہ سمجھی یہ رشکِ پری اس کے تئیں — دکھائی دی عشوہ گری اس کے تئیں
چڑھا ان نے تیوری اک انداز سے — کہا بیمزہ ہوکے یوں ناز سے
کہ جس کو نہ ہو تاب لانے کی تاب — شتابی سے مرنا ہے اس کا صواب
سوا سامنے اس کے میں حرف زن — یہ اس کی زباں سے کہا میں سخن
جوں سُنتے ہی کرکے ادھر نگاہ — سفر کرگیا جان سے بھر کر آہ

یہی ماجرا کہنے آیا ہوں یاں — خبر اس کے مرنے کی لایا ہوں یاں
کہہ اس سے کہ اے کشتۂ غم کی جان — گیا آخرالامر جی سے جوان
یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا — کہ اک شور کانوں میں میرے پڑا
گزرنے لگی دل سے آواز آہ — لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحے کی آنے لگی — کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی
محبت نے کام اپنا پورا کیا — کہ ان دونوں لعلوں کو چورا کیا
فقیر آن کر سخت نادم ہوا — کہ میرے سبب دونوں کا جی گیا
یہ بھی جائے گریہ ہے ساقی سُنا — کہ بدلے گزک کے ہے یاں دل بُھنا
تھوڑی دارو دے سایۂ تاک میں — برنگِ گل اب لوٹیے خاک میں

مقولۂ شاعر

عجب نہیں جانہ کھا پیش وتاب — یہ میر کی اب جو ہے عشق خانہ خراب
سُنا ہے کہ فرہاد پر کیا ہوا — پھر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا
عزا کا ہے مجنوں کی نوحہ پڑا — سیہ خیمہ لیلیٰ کا بھی ہے کھڑا
گئی جان وامق کی کس رنگ سے — ہوا خاک عذرا کا سرسنگ سے
گئی آہ نل کی فلک سے ادھر — دمن سے بگولہ زمیں کے اوپر
بہت عشق کی آگ میں جل گئے — بہت اُٹھتے جاتے ہیں شعلے نئے
گئی جل کے آخر پتنگوں کی جاں — چراغوں سے اک دودِ دل ہے کشاں
ہے بیتاب ذرّہ اسی سے کباب — جلے ہے اسی آگ میں آفتاب
دل اس داغ میں مہہ کا بنا ہی ہے — کتاں کا جگر چاک سُنتا ہی ہے

سیہ رنگ اُگتا ہے سروِ سہی وہی رنگِ قمری ہے خاکستری
بھنور کے بھی جی پر پڑے گل گئی کنول کی کھلی آنکھ پھر مند گئی
کوئی نالہ بلبل سے ہے یادگار خزاں اس چمن میں ہے گل کی بہار
کہیں ساقی دے آب گلرنگ کو کشادہ بھی کر اس دل تنگ کو

گلے لگ کے مینا کے ٹک رویئے
فسانہ بھی آخر ہے اب سویئے

بعض سوانحات میر

میر تقی میر دہلوی

مثنوی ننگ نامہ

پاؤ توفیق ٹک تو سر کو دھنو ‏ یہ بھی اک سانحہ ہے میر سنو

ہم کو درپیش تب سفر آیا ‏ جبکہ برسات سر ہی پر آیا

ابر ہونے لگے سپید وسیاہ ‏ پانی رستوں میں کیچ ساری رات راہ

بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب ‏ منھ اٹھانے کی جی میں ہوتی تاب

سو تو مکمل نہ تھو نہ لوئی ‏ سایہ گسترانہ ابر بن کوئی

ابر ہی بیکسی پہ روتا تھا ‏ ابر ہی سر کا سایہ ہوتا تھا

کیچ پانی کپڑے خوار ہوئے ‏ وہ ہیں گاڑی میں جاسوار ہوئے

رہروی کا کیا جو ہم نے میل ‏ بھینس چھلے کی تھے بہل کے بیل

آسماں آب سب زمیں سب کیچ ‏ خاک ہے ایسی زندگی کے بیچ

شب کے دریا پہ ہوکے راہ پڑی ‏ پانی کے سطح پر نگاہ پڑی

لجے لطمے کا کیا کہوں میں اوج ‏ باتیں کرتی ہے آسماں سے موج

دامن ابر پاٹ دریا کا ‏ دے گرہ تو کہے کہ باندھا تھا

ہوش جاتا تھا دیکھ جوش آب ‏ گوش کرتا تھا کر خروشِ آب

آب تہہ دار اور تیرہ بہت ‏ لہر اُٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفان ‏ دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان

ہمرہِ موج سیکڑوں گرداب ‏ ساتھ تھی صدتری کے چشم حباب

ناؤ ناؤ پاؤں ہم نے بارے رکھا ‏ خوف کو جان کے کنارے رکھا

جزرومد سب حواس کھوتا تھا ‏ خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا

جبکہ کشتی رواں ہوئی واں سے   جسم گویا کہ تھا نہ تھی جاں سے

موجہ اُٹھنے لگا جو طوفاں زا   لجہ آیا نظر سو عماں زا

کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم   ناخدائی خدانے کی اس دم

بلی لگتی نہ تھی نہ کچھ تھی تھاہ   عقل گم کردہ لوگ تھے ہمراہ

ریلا پانی کا جبکہ آتا تھا   خوف سے جی بھی ڈوبا جاتا تھا

خطرِ غرق سے تھی طاقت طاق   بیخودی سے ہوا تھا استغراق

بہتا پھرتا تھا خضر کشتی پاس   غوطے کھاتے تھے حضرتِ الیاس

بدبلا سے تھے ہمکنار ہوئے   تھا خدا ہی تو بلی پار ہوئے

کسو درویش کا تھا یمن قدم   جاکے پہونچے جو اس کنارے ہم

ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا   گوہرِ جاں سے ہاتھ دھویا تھا

اس کنارے کا جو اثر پایا   ہم تلاطم کشوں میں جی آیا

اس طرف اُترے آب کے جاکر   میرا اور پیر صاحب وچاکر

شکر لب پر دلوں سے محو گلا   کس وناکس سبھوں سے خضر ملا

پارکا گنج تھا جو شاہ درا   سب نے رہنا وہیں کا جی میں دھرا

فاصلہ ایک کوس کا تھا بیچ   راہ یاں سے تھی واں تلک سب کیچ

تھے بہت بیچ میں نشیب وفراز   پہنچے واں شام کھینچ رنج دراز

سو نہ جگہ تھی نہ مکانِ بیت   چار دکانیں ایک چھوٹی مسیت

جاکے حیراں ہوئے کدھر جاویں   سر گھسیڑیں جوٹک جگہ پاویں

لگ ودو ہر طرف لگے کرنے   تسپہ پڑتے تھے بیٹھ کے بھرنے

کوئی میداں میں کوئی چھپّر میں   کوئی در میں کوئی کسو گھر میں

گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ   جس سے بیت الخلا کو آئے تنگ

بیٹھنے دیں نہ جب کہ صاحب کو کون پوچھے نفر مصاحب کو
ڈھونڈتے ڈھونڈتے سراپائی ویسے گھر چھوٹے ویسی جاپائی
رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان جو کہا اُن نے ہم گئے سب مان
کچھ پکانے کا جب سوال کیا میں نے اظہار اپنا حال کیا
یاں جو لائے ہیں مجھکو اپنے ساتھ زندگانی مری ہے ان کے ساتھ
پہنچے ہے ان کے روبرو سے طعام صبح کا صبح مجھ کو شام کا شام
اور پکوایئے تو زاید ہو خاصے سے اپنے اور عاید ہو
جو کچھ آیا سو کھالیا میں نے کچھ رہا سو اُٹھا دیا میں نے
سن کے اک دل سے کھینچی ان نے آہ او ربولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاویں گے ہم کچھ ان کے سبب سے پاویں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم ہو گدا جیسے شاہ عالم تم
کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے بات دیکھیے کس طرح سے گزرے رات
صدقے ہیں ایسے بھی اُتارے کے سوگئے بخت گھر ہمارے کے
میں کہا مہترانی جی کچھ لو مجھ سے آزردہ دل نہ اتنی ہو
بعض کھاتے ہیں کچھ کھلاتے ہیں بعض مجھ سے بھی آتے جاتے ہیں
بارے جوں توں ہوئی وہ رات تمام صبح کو صاحبوں کا ٹھہرا مقام
یہ بھی دن شب ہوا سحر تھا کوچ غازی آباد کو گئے سب پوچ
راہ طے کر سرا میں جا اُترے کچھ ستم دیدہ پاس آ اُترے
صاحب اُترے حویلی میں آکر باغ میں اس کے سب نفر چاکر
بارور تھے درخت سب یہ بھی پھل ولیکن کنھوں نے پایا بھی

اس بھی منزل میں ایک روز رہے — گزرے جس طور کوئی کس سے کہے

لوگ جس دم سوار ہونے لگے — اور اسباب بار ہونے لگے

سوئنی اس رواداری میں گئی — لوگ تھے مضطرب جگہ تھی نئی

وحشت اس کو زبس کہ طاری ہوئی — سرپٹک کر کسی طرف کو موئی

ادھر ادھر تلاش کر دیکھا — گم شدہ کو نہ بھر نظر دیکھا

ساری بستی میں جست وجو کو گیا — دیر تک یہ خیال سب کو رہا

جن کی آتی ہے ایسے جاتے ہیں — کہ نہ پھر کھوج ان کا پاتے ہیں

مرگ تھی اس کی اس جگہ تقدیر — بلی تھی یاکہ گربۂ تصویر

رنگ جیسے کہ وقت گرگ ومیش — یعنی سرخی تھی کم سیاہی بیش

جن سے مالوف تھی وہیں رہتی — ان سے کچھ کچھ نگاہوں میں کہتی

کیا نفاست مزاج کی کہیئے — ستھری اتنی کہ دیکھ ہی رہیئے

خال جوں پھول گل کترتے ہیں — یاکہ نقشوں میں رنگ بھرتے ہیں

چوہے چڑیا پہ ان نے کب کی نظر — ج کا کرنا نہ فرض تھا اُس پر

موہنی بھی تو تھی بہن اُس کی — نسبت اس کی تھی وہ بہت گھسکی

پاوے جو کچھ سو مار کھاوے یہ — ایک کیا چار چار کھاوے یہ

جانور مارنا تو ہے یک سو — تیز پنجہ کیا نہ اُن نے کبھو

یہ نزاکت اسی کو بن آوے — موش وشتی کو دیکھ ڈرجاوے

ان نے مارے ہیں ایسے کتنے ڈھونس — گھونس دیکھی تو ہووے کوئی گھونس

یہ چھچھوندر کے بولتے بھاگے — وہ پڑی سوتی بھی ہو تو جاگے

چھپکلی سے یہ پھیر منھ کو لے — وہ جفا کار جیفہ پرجی دے

یہ پری سی تھی جو خرام کرے — وہ جو اچھلے تو دھوم دھام کرے

کبک اس کی خرام کے عاشق — جانور اس کے نام کے عاشق
غرض افسوس کی جگہ بلّی — اب کہاں گوکہ چھائیے دلّی
ایسی بیگم مزاج بلّی کھو — بیگم آباد ہم گئے یارو
واں سے میرٹھ سبھوں نے کی منزل — کیچ پانی اگرچہ تھا حائل
گرتے پڑتے پہونچ گئے سارے — ہم جفائے سپہر کے مارے
واں سے لاڈر نسنگ پھروان سے — جاکے واں تنگ آگئے جاں سے
اک گڑھی بود و باش کو پائی — کچھ نہ کھانے کو جس میں نے کھائی
پھوٹی پھاٹی سی چار دیواری — اور میدان تھی گڑھی ساری
پھر نہ میدان بھی برابر تھا — ہر قدم ایک غار و چقر تھا
کھنڈرسے اس میں تین چار مکان — جنکا گرنے پہ سخت ہے میلان
وہ گڑھی ساری کھتے ناج کے تھے — برسوں سے تھے پڑے نہ آج کے تھے
خاک مٹی سے ان گڑھوں کو بھرا — بنگلا اک لاکے اس کے بیچ دھرا
خشتی پائے اگر نہ بنواتے — باؤ میں اس سمیت اُڑ جاتے
باؤ جنگل کی تند کچھ نہ رکاؤ — مینھ میں چل پڑے تو کانپے جاؤ
اک گڑھی جس کی سیکڑوں راہیں — واں ٹھہرنے کو چاہیے باہیں
وہ رہے جورکھے دست سے لوگ — یا کوئی جوگی جو کرتے واں جوگ
ورنہ مشکل بہت ثبات قدم — دل میں اک ہول ہی رہے ہردم
باؤسی دن کو سائیں سائیں کرے — رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے
گر شکستہ ہوئی کہیں دیوار — بے زری سے بنانا ہے دشوار
ہفتہ ہفتہ تلک پڑی ہے خراب — پردہ کا ہے کا پھر ہے رفع حجاب
کار پر وازوں کو تقید ہے — شور ہے گالی ہے تشدد ہے

دے بچارے بہانے کرتے ہیں ‏ رات دن لوگ چوکی بھرتے ہیں
کہتے ان سے تو یہ ملے ہے جواب ‏ کس کے گھر سے بنادیں لا کے شتاب
ہم کو کھانے ہیں کا تردّو ہے ‏ صبح بقال کا تشدّد ہے
بنیا منھ کو چھپائے جاتا ہے ‏ روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے
حال کب پوچھنے کے ہے قابل ‏ ہم فقیروں کے رنگ ہیں سائل
سوچیں ہیں جب تو بھول جاتے ہیں ‏ بات کہتے ہیں بھول جاتے ہیں
تم کو دیوار پاکھے ہیں گے یاد ‏ ہم کو کرتا نہیں خدا آزاد
کس کو موسیں کہاں سے کچھ لادیں ‏ دال آٹا جو تم کو پہونچادیں
تم کہو دال ماش کی ہے زبوں ‏ یاں بہم پہونچے ہے جگر ہوخوں
تم کہو آٹا کر کرا کھایا ‏ یاں کلیجہ چھنا تو ہاتھ آیا
اور دوچار روز یہ بھی ہے ‏ ایک غم سینہ سوز یہ بھی ہے
فصل ہونے ابھی نہیں پائی ‏ پیشگی سب سے قرض لے کھائی
جس سے جھوٹے ہوئے ہیں ہم موس بار ‏ چوٹھا وہ کہے ہے ساہوکار
ماش کی دال کا نہ کریے گلا ‏ گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا
چاہتے ہو تو مول لو اک بز ‏ ورنہ بیٹھے رہو بنے جزبز
بکری لینے کو پیسے ہیں کس پاس ‏ کھاؤ دال اور پادو بے وسواس
جی اگر چاہے کوئی ترکاری ‏ گول کدو ملے بصد خواری
بھنڈی بیگن کے ناتوں ڈھینڈس تھا ‏ اروی توری بغیر جی بس تھا
جز کدو پادے کلو مدھو کیا ‏ یعنی کچھ اور واں تھا کدو کیا
دارو گولی کے کچھ نہ تھے اسباب ‏ ماش کی دال کھاتے تھے احباب
جو گڑھی میں نہ چھوٹتے یوں گوز ‏ بجتی رہتی تپک کہاں سے روز

گھاس ہی گھاس اس مکاں میں تمام — تس میں لستاغ جانور اقسام
جیسے زنبور زرو ایسے ڈانس — کاٹ کھاویں تو اچھلو دو دو بانس
پشۂ وکیک اور کتی تھی — جن کے کاٹے اچھلتی پتی تھی
ہاتھ پنڈوں پہ سب چلے جاتے — شبگزروں سے بدن جلے جاتے
ان کے کاٹے بدن پہ دانا ہے — مرچ جدوار پھر لگاتا ہے
ایک دو دن جلا فراغ ہوا — اس کی جاگہ سیاہ داغ ہوا
نہ کھجاتے کھجاتے سارے گھسے — چھٹے چھٹے ہوئے جو دانے نسپے
دن کا وہ صورت طعام ہوئی — رات کو نیند یوں حرام ہوئی
کتوں کے چاروں اور رستے تھے — کتے ہی واں کبھو تو بستے تھے
دو کہیں تھے کھڑے کہیں بیٹھے — چار لوگوں کے گھر میں ہیں بیٹھے
ایک نے پھوڑنے باسن ایکو نے — کھود مارے گھروں کے سب کونے
کوئی گورا کرے کوئی بھونکے — خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے
سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک — شور عف عف سے آفت آئی ایک
گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے — روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے
ایک نے آکے دیگچا چاٹا — ایک آیا سو کھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا — پھر پیا آکے تیل اگر چھوڑا
گھورنے اک لگا اندھیرا کر — ایک نے اور ایک پھیرا کر
گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیے — ہانڈی باسن گرا کے چھوڑ دیے
لوگ سوتے ہیں کتے پھرتے ہیں — لڑتے ہیں دوڑتے ہیں گرتے ہیں
جبکہ ہڈی یہ چار چار لڑیں — گوشت پر بھیڑیے سے دوڑ پڑیں
ایک کے پیچھے ایک روز و شب — لینڈی سی واں نہ بندھ رہی تھی کب

کتے ہی واں دو چار رہتے ہیں | دو گئے بھی تو چار رہتے ہیں
جاگتے ہو تو دو بدو کتے | سو کر اٹھو تو رو برو کتے
سر پہ دربان کتے بلا ہی رہے | کتا ایک آدھ گھر میں جا ہی رہے
منھ میں کف دور دور کرنے سے | حال بے حال شور کرنے سے
تو کہے سکے وہ گلا پھاٹا | باؤلے کتے نے اُسے کاٹا
کتوں کی کیا ساجتوں کو کہیں | چچڑی سے رات دن لگے ہی رہیں
باہر اندر کہاں کہاں کتے | بام و در چھت جہاں تہاں کتے
جھڑ جھڑاوے ہے کان کو کوئی | رووے ہے اپنی جان کو کوئی
ایک طرف ہے چیڑ چیڑ کی صدا | یعنے کتا ہے چکی چاٹ رہا
ایک چھتنے کو منھ میں لے آیا | ایک چولھے کو کھودتا پایا
ایک کے منھ میں ہانڈی ہی کالی | ایک نے چلنی چاٹ ہی ڈالی
تیل کی کپّی ایک لے بھاگا | ایک چکنے گھڑے سے جالا گا
کتے یارو، کہے جان کا تھا روگ | جاں بلب ہوں نہ کسطرح سے لوگ
آدمی کی معاش ہو کیونکر | کتوں میں بود و باش ہو کیونکر
بستی دیکھی سوایسی تھی آباد | کہ بیابان سخت سے دے یاد
چار چھپر کہیں ماروں کے | کہ بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ | ڈھنڈھ سا اور جو کہیں ہے کچھ
پھوٹی ٹوٹی کوئی حویلی ہے | سو بھی میدان میں اکیلی ہے
ایک دو مردے سے پڑے ہیں واں | زرو ہو ہو گئے ہیں بے لب ناں
لوگ ایسے مکان سب ایسے | ایسی جاگہ سے اُٹیں دل کیسے
اور جو چار گھر نظر آئے | ان کی خوبی کھلے وہیں جائے

وہ بھی کولی چمار تھے کوئی   فاقوں کے زیر بار تھے کوئی
صورتیں کالی سوکھے سوکھے سے   سارے کنگال اور بھوکھے سے
چار دانوں کے واسطے جی دیں   جان کھاجائیں کچھ نہ جھجک لیں
اس سے آگے بڑھے تو دھنورتھے   اُجڑے پجڑے اُنہوں کے کچھ گھر تھے
اور آگے گئے تو تھا بازار   اس میں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا   تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا
ایک کے ساںواں اور تھوڑے چنے   چھبڑوں میں خاک دھول ایک کنے
جو تھا باقی رہا سو تھا کنگال   ناؤں کو کہتے تھے اسے بقال
اس کا عامل کے یاں اُٹھا مایا   اُن نے جیسا کیا تھا سو پایا
ایک کنجڑے کے چار گھٹی پیاز   تس پر اس کو ہزار مخرو ناز
کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی   اُس مچھندر میں کچھ بھی بھدرگ تھی
ایک دوکان تھی پساری کی   اُن نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی
اس سے جاکر جو مانگئے ہلدی   زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے   بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں   میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں
مانگو اس سے جو مرچ یادھنیا   دیوے لچّاوہی بتادھنیا
لونگ چورا نفر سے منگوایا   لال مرچیں کٹی ہوئی لایا
اور اشیا یہیں سے کریے قیاس   آگے جاتا نہیں کہا مجھ پاس
اور دس بیس گھر گنواروں کے   اور دوچار فاقہ ماروں کے
پھوٹی مسجد خطیب تھانہ اذاں   یہی خانہ خطیب کا تھاواں
نہ تھی قید صلوٰۃ ورسم صوم   اس پہ سیّد امام واں کی قوم

بندے سب جن کا تھا خدا نہ کوئی — اس طریقے سے آشنا نہ کوئی
راہ ورسم وطریق سب بیڈھب — پہلے گالی تھی پیچھے حرف بہ لب
کوسوں بھاگا اگر ملا کوئی — صحبت ایسوں سے رکھے کیا کوئی
ایک تکیہ نہ جسمیں فرش کاہ — حال درویش قابل صد آہ
ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اس کو — مرض جوع لاعلاج اُس کو
برسوں چلا کے نا اُمید ہوا — چپکی سادھی جگر میں چھید ہوا
آتے جاتے سے اُن نے جو پایا — اُسی پر رہگیا وہی کھایا
گرو جو چار خاک کے سے ڈھیر — جن کوک کہتے تھے لیٹے ہیں یاں شیر
اپنا تو اعتقاد تھا ہی کم — پر کبھو بلی بھی نہ دیکھی ہم
کچھ نہ دیکھا ہم اُن بھی گوروں سے — کام نکلا سو اپنے زوروں سے
کی توجہ جونک دروں کی اور — دل جگر پر مرے پڑا کچھ زور
جس سے چھاتی میں درد ہونے لگا — رنگ چہرے کا زرد ہونے لگا
پھر زمینداروں میں نفاق ہوا — یہ عجب اور اتفاق ہوا
دونوں کا اک جداہی مطلب ہے — یہ کہے روز وہ کہے شب ہے
آس پاس اُس گڑھی کے آئی جھیل — گم تھے برسات میں طریق وسبیل
ایدھر اُدھر اُتر کے پانی جاؤ — قہر ہے پھر جو ٹک بھی ہووے چڑھاؤ
اُس سے واں کی ہوا بہت مرطوب — ہووے نزلہ زکام بے اسلوب
کتنے روزوں میں ہوتی ہے کھانسی — ایسی جیسے گلے میں دیں پھانسی
پھر وہ درجہ ہے جس میں ہووے دق — یہ کوئی نکلی ایک ثالث شق
پڑی آفت خطر تھا سکھوں کا — کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
اس میں آجاتے تو قیامت تھی — مال وجاں غرض سبکی رخصت تھی

نہ کوئی دادرس نہ وقت داد　　مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد
کیا کڈھب چرخ کج نے پھینکا تھا　　پرخدا کچھ ہمارا سیدھا تھا
جس نے قدرت نمائی کی اپنی　　اس بلا سے رہائی کی اپنی
بس قلم ہے صریر تیری تند　　شور سے توپڑا جہاں میں ڈنڈ
بدزبانی کا مجھ کو کب ہے دماغ　　ایسی باتوں سے میں کیا ہے فراغ
ہوچکی صاحبوں کی فرمایش　　چپ رہ اب ہے زمان آسایش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثنوی خواب خیال میر

خوش حال اس کا جو معدوم ہے | کہ احوال اپنا تو معلوم ہے
رہیں جان غمناک کو کاہشیں | گئیں دل سے نومید سو خواہشیں
زمانے نے رکھا مجھ متصل | پراگندہ روزی پراگندہ دل
گئی کب پریشانی روز گار | رہا میں تو ہم طالع زلف یار
وطن میں نہ اک صبح میں شام کی | نہ پہونچی خبر مجھ کو آرام کی
اُٹھاتے ہی سر پہ پڑا اتفاق | کہ دشمن ہوئے سارے اہل وفاق
جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ | دکھانے لگے داغ بالائے داغ
زمانے نے آوارہ چاہا مجھے | مری بیکسی نے نباہا مجھے
رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی | غریبی نے اک عمر کی ہمسری
مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا | غریبانہ چندے بسر لے گیا
بندھا اس طرح آہ بار سفر | کہ نے زاد رہ کچھ نہ بارِ سفر
دل اک بار سو بیقرارِ بتاں | غبار سرِرہ گزار بتاں
گرفتار رنج ومصیبت رہا | غریب دیارِ محبت رہا
چلا اکبرآباد سے جس گھڑی | درو بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیونکہ کروں | مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
دل مضطرب اشکِ حسرت ہوا | جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
کھنچا ساری رہ دامنِ چاک دل | رہا برقفا روے غمناکِ دل
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت | بہت کھینچے یاں میں نے آزاد سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہوگیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھو سنگ دردست رہنے لگا

کبھو غرق بحرِ تحیر رہوں
کبھو سر بجیب تفکر رہوں

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا
کہ کارجنون آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پرگرپڑی
تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی

مہہ چاردہ کار آتش کرے
ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

تو ہم کا بیٹھا جو نقشِ درست
لگی ہونے وسواس سے جان ست

نظرآئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خورو خواب میں

اگر چند پرتو سے مہہ کے ڈروں
ولیکن نظر اس طرف ہی کروں

ڈروں دیکھ مائل اسے اسطرف
بحدے کہ آجائیں ہونٹھوں پہ کف

رہی فکر جاں میرے احباب کو
اڑادیویں سب گھر کے اسباب کو

ہوئے پاس کوئی تفاوت سے ہو
سراسیمہ کوئی محبت سے ہو

کوئی فرط اندوہ سے گریہ ناک
گریباں کسو کا مرے غم سے چاک

جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے
نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

کہے چشم بندی کو ہر بار غیر
ولے منزل دل میں اس مہہ کی سیر

وہی جلوہ ہرآن کے ساتھ تھا
تصور مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہوں ولے بے خبر
وہ صورت رہے میرے پیش نظر

اُسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
وہی ایک صورت ہزاروں جگہ

نگہ گردش چشم سے فتنہ ساز
مژہ آفتِ روز گارِ دراز

عجب رنگ پر سطح رخسار کا
مگروہ تھا آئینہ گلزار کا

جو آنکھ اُس کی بینی سے جاکر لڑے
دم تیغ پر راہ چلنی پڑے

مکاں کنج لب خواہش جان کا
تبسم سبب کاہش جان کا

دہن دیکھ کر کچھ نہ کہیے کہ آہ — سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ
سزا ہے جگر اس کسو کے لیے — جو سیب ذقن اس کا بوکر جیے
گل تازہ شرمندہ اس روسے ہو — خجل مشکناب اس کے گیسو سے ہو
سراپا میں جس جانظر کیجیے — وہیں عمر اپنی بسر کیجیے
کہیں مہ کا آئینہ دردست ہے — کہیں بادۂ حسن سے مست ہے
کہیں نقش دیوار دیکھا اُسے — کہیں گرم رفتار دیکھا اُسے
کہیں دلبری اُس کو درپیش ہے — کہیں مائل خوبی خویش ہے
کہیں جملہ تن مہر صرف سلوک — کہیں مجھ سے سرگرم حرف سلوک
کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز — کہیں ایسا وہ بصد رنگ ناز
ہر اک جائے لے ناز سے وہ سبق — درو بام تصویر کا ساورق
بغل میں کبھو آرمیدہ رہے — کبھو اپنے بر خویش چیدہ رہے
کبھو صورت دلکش اپنی دکھائے — کبھو اپنے بالوں میں منھ کو چھپائے
کبھو گرم کینہ کبھو مہرباں — کبھو دوست نکلے کبھو خصم جاں
کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ — کبھو دست بردار ہو جائے وہ
گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو — طرح دشمنی کی نکالے کبھو
کبھو چیں بہ ابرو کبھو ہنسکے بات — کبھو بے وفائی کبھو التفات
ہر اک رات چندے یہ صورت رہی — اسی شکل وہمی سے محبت رہی
دم صبح ہو گرم رہ سوے ماہ — کہ درپیش آوے یہ روز سیاہ
کہ جھوما کروں بید مجنوں کی طرز — رہے یاد اس سرو موزوں کی طرز
رہوں زرد میں گاہ بیمار سا — پریشاں سخن گہ پریدار سا
پری خوان کو لاکوئی افسوں پڑھائے — کسو سے کوئی جاکے تعویذ لائے
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے — نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے
کہ سر رشتہ تدبیر کا گم ہوا — دل اوپر ہجومِ توہم ہوا

دروں خود بخود بے حواسی رہی   پریشاں دلی اور اُداسی رہی
کروں بیکلی جاؤں تا ہر کہیں   نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں
قیامت جنوں کا رہے سر میں شور   کھنچا جائے دل کوہ و صحرا کی اور
رہے شوق سر در گریبانِ دل   ہوا کھینچے صحرا کو دامانِ دل
سر آشفتہ زلفِ گرہ گیر کا   قدم حلقہ درگوش زنجیر کا
جنون آہ درپے ہوا جان کے   مجوز ہوئے یار زندان کے
کیا بند اک کوٹھری میں مجھے   کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے
لبِ نان اک یار دینے لگے   دم آب دشوار دینے لگے
کہاں علم کا کسب فرصت نہ آہ   ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ
نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے   کہ کیا جانیے کیسی صحبت بنے
وہ آشفتہ سر ہوشمندی سے دور   نہیں رابطہ مقتضائے شعور
وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر   در اُس کا نہ کھلتا تھا دو دوپہر
جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا   تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا
سر شام بیٹھا تھا میں ایکے روز   افاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز
کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی   مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی
اگر چند کہنے کو خوں کم کیا   لیا لوہو اتنا کہ بیدم کیا
بڑی دیر تک خون جاری رہا   میں بیہوش وہ رات ساری رہا
جگایا سحر مجھ کو اک شور سے   کھلی آنکھ میری بڑی زور سے
وہی دستِ فصاد میں نشتر   وہی رنگ صحبت کا پیش نظر
وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھر   وہی تر لہو میں مرا جامہ پھر
لگے نشتر ایسے کہ لگتے نہیں   چبھے جیسے مژگاں کسو کے تئیں
ہوا خون سے دامن وجیب تر   رگِ جاں تلک زخم پہونچا مگر
ٹپکتا رہا دیر تک خون ناب   مجھے لے گئی بیخودی کی شراب

سخن ضعف سے سخت دشوار تھا پلک کا اُٹھانا بھی اک بار تھا
کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا خمار ایک مدّت تلک پھر رہا
کھڑا ہوں اگر پاؤں لغزاں رہے بند بید کی طرح لرزاں رہے
چلا جائے سر پاؤں تھر تھر کرے نسیم سحر کارِ صر صر کرے
جفا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی افاقت گئی یوں کہ گویا نہ تھی
پس ازچند آنکھیں ٹھہرنے لگیں نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
بندھا ناتوانی کا رختِ سفر کیا طاقتِ رفتہ نے منھ ادھر
کے تھامری زندگانی کا دھیان ولیکن نہایت تھا میں سخت جاں
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
پھرا ناتواں میں بہت دور سے کہ نزدیک تھا عالم گور سے
غلط کاریٔ وہم کچھ کم ہوئی صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی
وہ صورت کا وہم اور دیوانگی لگی کرنے درپردہ بیگانگی
پس ازدیر آنکھوں میں آنے لگی نہ دو دوپہر منھ لگانے لگی
نہ دیکھے مری اور اس پیار سے غریبانہ سر مارے دیوار سے
کہیں تک تسلّی کہیں بیقرار کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہے خون کہیں دست زیرِ زنخ ہے ستون
کہیں دل کو اپنے دکھا دے مجھے مری بیوفائی جتادے مجھے
کہیں دست بردل وہ رشکِ قمر کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر
کہیں بیدماغانہ سر گرمِ ناز کہیں آتشِ شوق سے جانگداز
کہیں چشم گریاں سے دامان پاک کہیں سوجگہ سے گریبان چاک
کہیں کام دل کی شکایت سے ہے کہیں نقشِ دیوار حیرت سے ہے
کہیں مجھسے کہتی ہے رخصت مجھے کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے
کہیں لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں کہ ٹپکا کرے جس سے آزار جاں

کہیں وہ نگہ جس سے یہ پایئے　　کہ یہ دردوں ہے تو مٹ جایئے
کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب　　کہیں وہ طرح جس سے رہیے خراب
کہیں حرف زن اس طرح ناز سے　　کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے
کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو　　کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو
کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے　　کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے
کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے　　کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے
کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے　　کہے تو کہ بیزار ہے جان سے
کسو وقت اُس کا یہ اسلوب ہے　　کہ شرم محبت سے محبوب ہے
کبھو بیقراری ہے اس رنگ سے　　کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے
کبھو بے ادائی و دشنام ہے　　کبھو باد کے ہاتھ پیغام ہے
کہ اے بیوفا آہ دل نرم کرے　　محبت کی بھی منہ سے کچھ شرم کر
کبھو وہ تبختر کہ پروانہیں　　کبھو کیونکہ کہیئے کہ سودا نہیں
کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد　　کہ اے بیوفا حرف من یاد باد
کہ ظاہر میں میر اب توانا گیا　　کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا
غرض نا اُمیدانہ کراک نگاہ　　وہ نقش تو ہم گیا سوے ماہ
نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح　　نہ دیکھا اسے جلوہ گر اس طرح
مگر گاہ سایا سا مہتاب میں　　کبھو وہم سا عالمِ خواب میں
دل خوپذیر وصال و دام　　رہے خواب میں روز و شب صبح و شام
اگر وصل خواب فراموش تھا　　ولیکن وہی خواب کا جوش تھا
پلک سے پلک آشنا ہے وہی　　زخود رفتگی کی ادا ہے رہی
کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں　　رگِ خواب دل ہے کفِ شوق میں
جو بیٹھا ہوں خواب گراں ہی مجھے　　وہ غفلت جہاں درجہاں ہی مجھے
خیال اس کا آوے کہ سن ہو رہوں　　تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یونہیں کھوتے گئی　　جوانی تمام اپنی سوتے گئی
دکھایا نہ اُس مہ نے روخواب میں　　نہ دیکھا پھر اُس کو کبھو خواب میں
بہت بیخود و بے خبر ہو چکا　　ہم آغوش طالع بہت ہو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

مثنوی در مذمّتِ دُنیا

سنو اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل
کہ اس کارواں گہہ سے کرنا ہے نقل

پیمبر ہے شہہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

کہو گے کہ آگے تھا کہتا کوئی
نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی

بجاہی کیا کوس رحلت مدام
کنھوں نے نہ بجتا سنایاں مقام

یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
جہاں جملہ ہے ایک بزمِ رواں

جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود اور باش

گدا ہو کہ ہوشاہِ عالی تبار
تہہ خاک سب کا ہے دارالقرار

نہ یک بوئے خُش ہی ہوا ہوگئی
وہ رنگینی باغ کیا ہوگئی

ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر
پریشاں ہوئے مرغِ گلشن کے پر

پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا
چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا

گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ
رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ

رہی راکھ ہوکر اگر آگ تھی
رکن ہے جہاں باد کی لاگ تھی

نہ جدول رہے گی نہ سردِ رواں
گلستاں کو پاویں گے ہوکا مکاں

زمیں کا رہے گا یہی کیا سبھاؤ
پٹ جائیں گے آسماں جیسے تاؤ

سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب
چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب
نہیں جائے باش اور جا ہے عجب

بھلاجی کے جانے کا کیا ہے بیاں
عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کورواں

جوانی گئی موسم شیب ہے
شہود ایک دوروز کو غیب ہے

ہنسوں کیونکہ ہستی میں دنداں نما
کہ ہے جائے دنداں ہی دنداں نما

گیا شور سر سے جھکا ہے بہت
گئی واشداب دل رکا ہے بہت

نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام
مزا کچھ نہیں ہوچکی صبح وشام

کریں لمس کیا ہر گھڑی ہی صداع
نہیں لذت اکل وشرب ووقاع

بلا ارتعاشِ تنِ زار ہے
ہر اک عضو چلنے کو تیار ہے

ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف
نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

نہ پوچھو لب ولہجہ بے طور ہے
سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کسے ذوقِ صحبت کہاں ہے دماغ

نہ کچھ یونہیں عینک نظر چڑھ گئی
بصارت کی بیطاقتی بڑھ گئی

نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر
کہے تو کہ اعمیٰ ہیں ہم بے بصر

رہیں دیکھ بھو حرف زن ہو حریف
رہا سننے کے گوں نہ سمع شریف

صدافسوس لطفِ سماعت نہیں
صدا دور سے جیسے آوے کہیں

شباب آہ داغِ جگر دے گیا
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کھچ زورِ بازو بہت کم ہوا
جھکا سر سوزانو کا ہمدم ہوا

جوانی کی شب کیا بسر ہوگئی
سفیدی موسے سحر ہوگئی

بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار
کرے کون خوباں سے بوس وکنار

جو یہ چال ہی جارہے ہیں ہم اب
دموں پر غرض آرہے ہیں ہم اب

کھڑے ہوں تو تھرّائے ران اور ساق
جئیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہی شاق

اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم
یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم

کہے میں نہیں اپنے تک پاؤ دست
کیا خاک میں مجھ کو پیری نے سخت

جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں
اگر منہ کو دیکھو تو وہ رو نہیں

بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور
دے آنکھیں نہیں دے نہ چتون کے طور

جسدناتواں جائے مہمان تنگ
سخن منہ پہ آوے وداعی کے رنگ

لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ　　در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل کو پژمردگی　　غریزی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آگئی　　مزاجی تھی گرمی سو ٹھہراگئی
چھڑکتا رہوں منھ پہ میں آب کاش　　کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش
وگر نہ دیا سا بجھا جائے ہے　　پھر اُٹھ بیٹھوں تو بھی چلا جائے ہے
سیہ روئے شیب اک ستم کرگیا　　لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مرگیا

قلم رکھدے کر میر ختم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

مصنف کی قلم سے

اُردو ناولٹ کا مطالعہ	2003	250/-
سراج اورنگ آبادی حیات اور شاعری	2004	100/-
مثنویاتِ میر کا تنقیدی مطالعہ	2011	280/-
تنقیدی اظہارات (تنقیدی مضامین)		زیرِ طبع

ایم آر پبلی کیشنز کی مطبوعات 2011

ادبیات/تحقیق و تنقید

اجڑا دیار — شاہد احمد دہلوی — 225/-
اجڑے نگر کا چراغ (ناول) — سبط احمد قمر — 250/-
احسن القصص (مکمل 4 جلدیں) — عبدالصمد — 200/-
ادبی محاکے — ڈاکٹر احمد امتیاز — 150/-
اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک) — ڈاکٹر تبسم کاشمیری — 750/-
اردو ادب میں سفرنامہ — انور سدید — 475/-
اردو کے مزاحیہ افسانے — ڈاکٹر مظہر احمد — 220/-
اردو کے منتخب رپورتاژ — ڈاکٹر طلعت گل — 280/-
اردو میں سیاسی شاعری کی ادبی قدر و قیمت — پرویز احمد اعظمی — 300/-
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت — ڈاکٹر عابد حسین حیدری — 400/-
اردو ہے جس کا نام — فاروق ارگلی — 600/-
ارمغانِ ادب — امتیاز احمد/عطیہ رئیس — 100/-
امیر خسرو (میوزیکل اوپیرا) — فصیح اکمل — 100/-
امیر خسرو عہد، فن اور شخصیت — عرش ملسیانی — 120/-
ایوانِ غزل (ناول) — جیلانی بانو — 160/-
آدمی نامہ (مزاح) — مجتبیٰ حسین — 80/-
آزادی کے بعد اردو شاعری کے ارتقا میں غیر مسلم شعرا کا حصہ — ڈاکٹر ای اے حیدری — 500/-
بدچلن (افسانے) — پرمود بھارتی — 100/-
بزم شاہد — شاہد احمد دہلوی — 200/-
بلخ کا بچہ اور دوسری کہانیاں — سید محمود الحسن — 50/-
بہادر شاہ ظفر کی دلّی — سید ضمیر حسن دہلوی — 250/-
بھارت کا آئین (سہ لسانی اڈیشن) — خواجہ عبدالمنتقم — 550/-
پرچھائیوں کے اجالے — حمیدہ سالم — 200/-
پریس کی آزادی اور صحافیوں کے لیے ضابطۂ اخلاق — خواجہ عبدالمنتقم — 120/-
پس تصویر — راشد عزیز — 200/-
پنجابی اردو بول چال — عبدالصمد — 60/-
پیچھے کوئی ہے (ڈراما) — عتیق اللہ — 60/-
پیغمبرانِ حق — ڈاکٹر عقیل ہاشمی — 150/-
تاریخ نسواں — عبدالعزیز ہاشمی — 450/-
تحفہ (کہانیاں) — لطیف رشیدی — 60/-
تخلیق کار قمر رئیس — پروفیسر علی احمد فاطمی — 200/-
تصوف اور خواتین اولیائے دہلی — ڈاکٹر حفظ الرحمٰن — 75/-
تعلیم برائے مساوات — پروفیسر طاہر محمود — 200/-
تکلف برطرف — مجتبیٰ حسین — 80/-
تلمیحات — مظہر احمد/نجمہ رحمانی — 120/-
تمدنِ ہند — سید علی بلگرامی — 500/-
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (جلد اول) — پروفیسر لطف الرحمٰن — 300/-
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (جلد دوم) — پروفیسر لطف الرحمٰن — 300/-
تنقید و تخلیق — پروفیسر لطف الرحمٰن — 200/-
تہنیت النساء تہنیت: شخصیت اور نعت گوئی — ڈاکٹر عرشیہ جبیں — 200/-
تھیٹر، پارسی تھیٹر اور آغا حشر کاشمیری — انیس اعظمی — 300/-
جاپان چلو جاپان چلو — مجتبیٰ حسین — 80/-
جدید اردو غزل (۱۹۴۷ سے ۲۰۱۰ تک) — ڈاکٹر راحت بدر — 350/-
جدید غزل کی علامتیں — ڈاکٹر نجمہ رحمانی — 200/-
چاندنی بیگم: ایک جائزہ — انوار الحق — 125/-
حافظ اور اقبال — ڈاکٹر شیریں زبان خانم — 200/-
حضرت محمد اور انسانی حقوق — خواجہ عبدالمنتقم — 40/-
خوش کلامیاں قلم کاروں کی — نارنگ ساقی — 200/-
دفتری طریق کار — منیر انجم — 75/-
دل کی آواز (افسانے) — ایم پرویز — 100/-
دلچسپ — بلقیس ظفیر الحسن — 50/-
رثائیات تجزیات شخصیات — ڈاکٹر عابد حسین حیدری — 225/-

رشید احمد صدیقی بحیثیت خاکہ نگار ڈاکٹر احمد امتیاز -/150
رشید احمد صدیقی کے فکری مناسبات ڈاکٹر احمد امتیاز -/80
زاویے (فراق کی نادر تحریریں) عبدالعزیز -/125
کن سنتاون کا قصہ: عزیزن (ڈراما)
تریپوراری شرما/ترجمہ: مظہر احمد -/100
سو ہے وہ بھی آدمی (مزاح) مجتبیٰ حسین -/80
شاعر دانشور فراق گورکھپوری پروفیسر علی احمد فاطمی -/200
صحافتی زبان مسکین علی حجازی -/160
صورت و معنی سخن شمس الرحمٰن فاروقی -/280
عکس احساس (شاعری) سرکار حیدر -/150
علی جواد زیدی: شخص و شاعر عابد حسین حیدری -/150
عمارت (افسانوی مجموعہ) ڈاکٹر نگار عظیم -/100
غالب اور آج کا شعور ڈاکٹر محمد علی صدیقی -/140
غبار خاکی سبط اختر -/125
غربت اور ناانصافی پروفیسر طاہر محمود -/150
غزل ہم سفر (شاعری) ڈاکٹر راحت بدر -/150
غیر افسانوی اردو نثر ڈاکٹر عطیہ رئیس -/200
فاروق ارگلی: اپنی تحریروں کے آئینہ میں
ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی -/300
فرہنگ تلمیحات ثوبان سعید -/300
فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ سید ضمیر حسن دہلوی -/80
فلک چھونے کی آرزو شمس رمزی -/300
فنون لطیفہ اور تخلیقی تخیل پروفیسر لطف الرحمٰن -/200
فن ادارت مسکین علی حجازی -/300
قصۂ درد سناتے ہیں پروفیسر طاہر محمود -/500
قوانین تحفظ صارفین خواجہ عبدالمنتقم -/300
گھٹتا بڑھتا پانی ڈاکٹر طلعت گل -/80
مبارک شمیم: شخصیت اور فن وسیم مینائی -/200
مثنویات میر کا تنقیدی مطالعہ صدیق محی الدین -/280
مجتبیٰ حسین کا فن: جمالیاتی مظاہر شکیل الرحمٰن -/60
محمد علی جوہر: شخص و شاعر آفتاب احمد آفاقی -/200
مولانا ابوالکلام آزاد کے منتخب اداریے محبوب فرید -/200
مہاراشٹر کی مختصر تاریخ پرویز عالم -/200

میرے زمانے کی دلی ملا واحدی -/150
میزان تحقیق ڈاکٹر محمد اکمل -/100
نثر کی شعریات پروفیسر لطف الرحمٰن -/180
نگار حقائق مظفر انصاری -/250
نیا ادبی شعور فصیح الدین احمد -/100
ہم دشت میں دیتے ہیں اذاں پروفیسر طاہر محمود -/400
ہم عصر اردو ناول پروفیسر قمر رئیس -/300
ہندو مسلم اتحاد اور مسلم سماج خواجہ عبدالمنتقم -/200
ہندوستان میں جدید اردو مرثیے کا ارتقاء
ڈاکٹر ای اے حیدری -/550
ہندوستان میں مسلم دور حکومت کا خاتمہ
ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی -/100
ہندوستانی مسلم خواتین کی علمی خدمات
ڈاکٹر ناہید ظفر -/500

ڈکشنریاں

فارسی اردو جدید فیروز اللغات -/600
اردو ہندی — ہندی اردو ڈکشنری
امام الدین رام نگری -/100

شاعری

اعراف مظفر افتخاری -/150
اکائی ڈاکٹر بشیر بدر -/50
امکان سے آگے نصراللہ نصر -/150
امیج ڈاکٹر بشیر بدر -/40
انتخاب کلام کشور ناہید مرتبہ: آصف فرخی -/50
انتخاب کلیات عالم لکھنوی الطاف حسین عالم لکھنوی -/550
انتخاب کلیات پروین شاکر مرتبہ: ڈاکٹر مظہر احمد -/50
انتخاب کلام ثروت مرتبہ: نگار عظیم -/200
انتخاب کلام سودا ڈاکٹر مظہر احمد -/50
انتخاب کلام میر ڈاکٹر عطیہ رئیس -/50
انکار پروین شاکر -/45
ایف آئی آر دلاور فگار -/50
آسمان ڈاکٹر بشیر بدر -/40

آس	ڈاکٹر بشیر بدر	40/-
آمد	ڈاکٹر بشیر بدر	40/-
آہٹ	ڈاکٹر بشیر بدر	40/-
باقیاتِ فانی	شوکت علی خان فانی	70/-
پسِ آشکار	احمد شناس	300/-
پھڑکتے ہوئے	کے ایل بھاگی	150/-
پیروڈی (مزاحیہ)	ڈاکٹر مظہر احمد	150/-
تریاقِ جنون (مزاحیہ)	مسرور شاہ جہاں پوری	150/-
تیرے سوا	میکش امروہوی	150/-
جنگلی پھول	منور رانا	45/-
حدِ نظر	فرزانہ ظفر	200/-
خمخانۂ افکار	شفیق دہلوی	150/-
خواب و خیال	رحیم اللہ شاد	200/-
خود کلامی	پروین شاکر	35/-
خوشبو	پروین شاکر	65/-
دشت میں خیمۂ گل	لطف الرحمٰن	200/-
سلگتے خواب	زاہد ٹانڈوی	200/-
شامِ نوروز (مع اضافہ)	پروفیسر قمر رئیس	50/-
شجر سے لپٹی ہوئی بیل	طارق قمر	200/-
شکوہ جوابِ شکوہ	علامہ اقبال	50/-
صحرا صحرا (اردو ہندی)	راج کمار قیس	250/-
صد برگ	پروین شاکر	45/-
صنم آشنا (نظمیں)	پروفیسر لطف الرحمٰن	200/-
عکس تاب	ڈاکٹر معصوم شرقی	200/-
عکسِ احساس	سرکار حیدر	150/-
غزل ہم سفر (اردو ہندی)	ڈاکٹر راحت بدر	150/-
فلک چھونے کی آرزو	شمس رمزی	300/-
فی سبیل اللہ	دلاور فگار	50/-
قندیلِ ہنر	طارق متین	100/-
کفِ آئینہ	پروین شاکر	35/-
کلامِ مطرب	مطرب بلیاوی	150/-
کلیاتِ اقبال	علامہ اقبال	100/-
کہا سنا معاف کرنا	دلاور فگار	50/-
کہو ظلِ الٰہی سے	منور رانا	50/-
گھنگرو	قتیل شفائی	50/-
لفظ لفظ آئینہ	ابوالخیر نشتر	100/-
ماں	منور رانا	25/-
مدھوشالا	ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن	100/-
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	50/-
مہاجر نامہ	منور رانا	50/-
ہندوستانی ترائیلے (اردو ہندی)	مجیب نشتر	160/-
یادوں کے چراغ	امیر چند بہار	150/-

English/Hindi Books

The Constitution of India
Khwaja A. Muntaqim 550/-
(Trilingual Edition: English-Hindi-Urdu)

Islam's Big 'No' to Terrorism
Khwaja A. Muntaqim 120/-

Muslim World & President Obama
Post-Osama Khwaja A. Muntaqim 120/-

The Master of Universe
Dr. (Brig) Mukhtar Alam 150/-

The Life & works of S.H. Manto
Dr. S.A. Jafri 250/-

W.S. Maughm Dr. S.A. Jafri 110/-

Safar Nama Ikram Naqvi 400/-

ग़ैर मुस्लिम शुअराए शाहजहाँपुर मुबारक शमीम / लतीफ़ रशीदी 140/-

खुशकलामियाँ क़लमकारों की नारंग साक़ी 200/-

झूट बोले कोआ काटे सिब्ते अख़्तर 200/-

तुझ बिन मैकश अमरोहवी 250/-

दिलचस्प बिलक़ीस ज़फ़ीरुल हसन 50/-

मकामाते औलिया-ए-रूहेलखण्ड
डा. मो. हिफ़्ज़ुर्रहमान 320/-

کیا آپ اپنی کتابیں چھپوانا چاہتے ہیں؟
تو کتاب کی اشاعت کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔

M.R. Publications
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910
E-mail: abdus26@hotmail.com

شیخ صدیقی محی الدین کا تعلق ضلع بیڑ کے قصبہ پاتوڑ شریف سے ہے، جو اُن کا آبائی وطن ہے۔ پاتوڑ شریف کے ضلع پریشد اسکول سے انہوں نے درجہ ہشتم تک تعلیم حاصل کی۔ 1975ء میں اُن کے والد شیخ صاحب محی الدین مع اہل وعیال ضلع بیڑ منتقل ہو گئے۔ ضلع بیڑ کے ملیہ ہائی اسکول سے انہوں نے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی امتحانات پاس کیے یہیں کے نوگن کالج سے 1982ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ 1984ء میں مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد سے ایم۔اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں 1985ء میں سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد سے ایم۔فل اور 1990ء میں اسی یونیورسٹی سے ''اُردو ناولٹ کا مطالعہ'' موضوع پر پروفیسر ثمینہ شوکت کی رہنمائی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ملازمت کا آغاز گورنمنٹ کالج اورنگ آباد کے شعبۂ اُردو میں لکچرر کی حیثیت سے ہوا، جہاں پر 1986ء تا 1991ء تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ نوگن کالج بیڑ میں جولائی 1992ء تا جولائی 1993ء تک لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آرٹس اینڈ سوشل سائنس میں ستمبر 1993ء تا اگست 1997ء تک بحیثیت لکچرر خدمات انجام دیں۔ پھر راشٹر ماتا اندرا گاندھی کالج جالنہ میں اپریل 1998ء تا جولائی 1999ء تک بحیثیت لکچرر خدمات انجام دیں۔ جولائی 1999ء تا حال وہ شعبۂ اُردو ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور آج کل اسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ ادب میں شاعری اور افسانوی ادب کی تنقید اُن کے خصوصی دلچسپی کا حصہ ہیں۔

M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

\# 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 0981078549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com